خواجہ عزیز الحسن مجذوب غوری مولانا اشرف علی تھانوی کے اجل خلفا میں تھے اس نسبت کے علاوہ وہ ایک ممتاز شاعر اور بڑے باغ و بہار شخص بھی تھے، اس کتاب میں انکی زندگی کے ان ہی مختلف دلآویز پہلوؤں کا ذکر ہے، اس سے مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کے اہم خلفا کی نظر میں خواجہ صاحب کی اہمیت و عظمت اور خود ان کی اپنے مرشد سے عشق و پور والہانہ تعلق کا پتہ چلتا ہے، اس میں خواجہ صاحب کے کلام پر مفصل تبصرہ اور آخر میں اس کا مختصر انتخاب بھی دیا گیا ہے، "ذکر مجذوب" کا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق ہے،

اردو طباعت و اشاعت کے مسائل

مرتبہ جناب انور کمال حسینی صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۰۴ قیمت مجلد ... پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰

نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا مرکزی وزارت تعلیم کے ماتحت ایک خود مختار ادارہ ہے، اسکے پروگرام میں ہندوستان کی مختلف اہم زبانوں کی منتخب کتابوں کی اشاعت کے علاوہ طباعت و اشاعت کی دشواریاں حل کرنا بھی ہے، چنانچہ اسکے زیر اہتمام مختلف زبانوں کے اشاعتی مسائل کے سلسلہ میں متعدد سمینار ہو چکے ہیں اردو طباعت کی مشکلات کا جائزہ لینے کیلئے جون ۱۹۷۷ء میں ایک سمینار سری نگر (کشمیر) میں ہوا تھا جس میں اردو کے مختلف اہل قلم اور طباعت و اشاعت کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والے حضرات شریک تھے، اس کتاب کے شروع میں سمینار کی رپورٹ، تجویزیں اور سفارشات درج ہیں اور آخر میں اس میں پڑھے جانے والے تمام مضامین دے گئے ہیں ان مضامین میں طباعت و اشاعت کی مختلف پیچیدگیوں سے بحث کی گئی ہے جیسے اردو کتابوں کی خرید و فروخت، کتبخانوں ناشروں، مصنفوں نئے اہل قلم، بچوں کے ادب، مذہبی و فنی کتابوں ترجمہ و طبعزاد تصنیفات کے مسائل وغیرہ، اکثر مضامین میں گزشتہ تیس سال کے اندر اردو پر جو سخت وقت گزر رہا ہے اسکا دکھڑا اور اس ضمن میں آزادی سے پہلے اردو کتابوں کی طباعت کی بہتر و موجودہ دور میں ابتر حالت کا ذکر آگیا ہے، دار المصنفین کے شریک ناظم مولانا عبد السلام قدوائی کو بھی سمینار میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تھا، ذاتی علالت و مصروفیت کی وجہ سے اس میں شریک نہیں ہو سکے لیکن انکا مقالہ پڑھا گیا اور وہ اس کتاب میں شامل بھی ہے، انھوں نے تقسیم سے پہلے اور بعد کے متعدد ایسے اہم اشاعتی اداروں کی خدمات بھی دکھائی ہیں جو مذہبی کتابیں شائع کرتے تھے اور انکی طباعت کی موجودہ حالت اور پریشانیوں کا ذکر بھی کیا ہے، رپورٹ میں مضامین پر اظہار خیال کرنے والوں کے خیالات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے، یہ سب چیزیں بہت مفید ہیں اور اس حیثیت سے یہ سمینار کامیاب تھا دیکھنا یہ ہے کہ آئندہ طباعت و اشاعت کی مشکلات رفع کرنے کیلئے کیا اقدام کیا جاتا ہے، "ض"

جلد ۱۲۲ ماہ ذی الحجہ ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۷۸ء عدد ۵

مضامین

جلد کے نمبروں کی تصحیح

ماہ اگست ۱۹۷۶ء سے اکتوبر ۱۹۷۸ء تک معارف کی جلدوں کے نمبر غلط ہو گئے ہیں، اگست ۱۹۷۶ء کا جلد نمبر ۱۱۸ اور اکتوبر ۱۹۷۸ء کا ۱۲۲ ہے، ناظرین اگست ۱۹۷۶ء سے اکتوبر ۱۹۷۸ء تک جلد کے نمبروں کی تصحیح کرلیں،

"اڈیٹر"

شذرات

معارف کے ناظرین کو یاد ہوگا کہ دار المصنفین اور حکومت پاکستان میں اس ادارہ کی مطبوعات کے حق طباعت واشاعت کا ایک معاہدہ ۱۹۷۶ء میں ہوا تھا، وہاں کی وزارت تعلیم نے یہ حق اپنے نشر واشاعت کے ایک ادارہ نیشنل بک فونڈیشن کے لئے پندرہ لاکھ پاکستانی روپیے میں خرید لیا تھا، اس کی پہلی قسط ۱۹۷۶ء ہی میں مل گئی تھی، اس کی دوسری قسط وہاں کے بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے اکتوبر ۱۹۷۸ء میں ملی،

اس سلسلہ میں خاکسار کا قیام پاکستان میں ۱۶ جون سے ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۸ء تک رہا، اس دوسری قسط کی منظوری پاکستان کے چیف مارشل لا اڈمنسٹر جناب جنرل ضیاء الحق نے دی جس کیلئے ہمارا ادارہ اُن کا بہت شکر گذار ہے، وہاں کے موجودہ وزیر تعلیم جناب محمد علی صاحب ہوتی کے سابق نوابی خاندان سے ہیں ان سے ملا تو معلوم ہوا کہ وہ ان دنوں کلام پاک کی تفسیر لکھ رہے ہیں، محکمۂ تعلیمات کے سکریٹری جناب ڈاکٹر اکرام اللہ قاضی صاحب ہیں، جو سندھ یونیورسٹی کے بہت ہی مایۂ ناز استاذ رہ چکے ہیں، ان دونوں حضرات نے اس رقم کی ادائگی کی کارروائی میں اپنے کریمانہ اخلاق اور علم دوستی کا ثبوت دیا، اس محکمہ کے جوائنٹ سکریٹری جناب ڈاکٹر طاہر حسین صاحب نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دس سال تعلیم پائی ہے، انھوں نے ازراہ کرم بقایا رقم کی ادائگی کی پر زور سفارش کی، اس کے ڈپٹی سکریٹری جناب حسن بھٹو صاحب نے اس کام کو آخری مرحلہ تک اس طرح پہنچایا جیسے یہ ان کا ذاتی کام تھا، اُن سے ملنے میں خوشی اور لذت محسوس ہوتی تھی، اس کے ڈپٹی فنانسل اڈوائزر جناب ممتاز احمد یمانی صاحب بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے ہیں، وہ مجھ سے علی گڑھ کے اولڈ بوائے کی حیثیت سے چھوٹے بھائی ہی کی طرح ملتے جلتے رہے، کسی موقع پر بھی دفتری کارروائیوں کی تاخیر سے مجھکو پریشان ہوتے دیکھنا پسند نہیں کیا،

محکمۂ خزانہ کے جوائنٹ سکریٹری نے بہت ہی عاجلانہ طریقہ سے کاغذات کو آگے بڑھا کر حوصلہ افزائی کی، اس کے ڈپٹی سکریٹری جناب محی الحق فاروقی صاحب تو میرے سایہ بن کر ساتھ رہے، اُن کے مفید

مشوروں سے بہت سی دقتیں دور ہوئیں، اس کے سکشن افیسر جناب نسیم احمد صاحب نے تو ہر قسم کی مدد دینے میں سبقت کی، جب ہمارے کاغذات جنرل ضیاء الحق کے سکریٹریٹ میں پہونچے تو وہاں کے جوائنٹ سکریٹری جناب ضیاء الرحمٰن صاحب اور ڈپٹی سکریٹری جناب سید جمال علی نے کارروائی کو آگے بڑھا کر بڑی عنایت کی،

تمام سرکاری عہدہ دار جس ہمدردی، اخلاق اور محبت سے پیش آئے، اُس کی یادیں ذہن میں برابر باقی رہیں گی، اسی اثنا میں جناب مولانا ابو الحسن علی ندوی رابطۂ اسلامیہ کی طرف سے ہونے والی ایشیائی کانفرنس میں شرکت کے لئے پاکستان تشریف لائے، تو وہاں اُن کی غیر معمولی محبوبیت اور بے پناہ پذیرائی سے بھی ہر طرح کے فوائد پہونچے، انھوں نے اپنی کرم گستری سے جنرل ضیاء الحق اور جناب اے۔ کے بروہی وزیر قانون وامور مذہبی سے گفتگو فرما کر اس بقایا رقم کی ادائگی کے لئے زور دیا، کچھ تاخیر ہوئی تو میں نے بھی جناب اے۔ کے۔ بروہی سے کئی ملاقاتیں کیں، وہ اپنی علم نوازی اور معارف پروری کی بدولت ایک علم دوست ہی کی طرح ملے، میری بہت سی مشکلیں آسان کیں، اُن کے بلند اخلاق اور شریفانہ طبیعت کا گہرا اثر دل پر ہے، اُن کو تصوف اور تاریخ ہند کے مطالعہ کا بھی ذوق ہے، میری کتاب بزم صوفیہ کا ذکر آیا تو میں نے ایک نسخہ اُن کی خدمت میں پیش کیا، دار المصنفین واپس آیا تو یہاں کی مطبوعات میں سے اُنکے مذاق کی کچھ اور کتابیں ارسال کیں،

اس کام کو انجام دینے میں جناب افضل چیمہ سے بھی مدد کا خواہاں ہوا، وہ لاہور ہائی کورٹ کے جج رہ چکے ہیں، اس وقت اسلامی نظریاتی کونسل کے صدر ہیں، اُن کو پاکیزہ اخلاق کا بہت اچھا نمونہ پایا، جب اُن کو میرے قیام کی طویل مدت معلوم ہوئی تو افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ میں یہ کام اُن کے ذمہ کر دیتا تو وہ خود اس کو انجام دینے میں خوشی محسوس کرتے، اُن کی اس ہمدردی سے رہین منت ہونا ضروری تھا

ماہ جون کی جھلسی ہوئی لو اور گرمی میں اسلام آباد پہنچا تو سب سے پہلے جناب نبی احمد خاں بلوچ سے ملا جو پہلے سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور آج کل وزارت تعلیم کے ثقافتی امور کے آفیسر آن اسپشل ڈیوٹی

ہیں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہے، دارالمصنفین کے علمی کارناموں کے بڑے مداح ہیں، میری حقیر تصانیف سے بھی اُن کو دلچسپی ہے، ۱۹۷۶ء میں دارالمصنفین سے جو معاہدہ ہوا تھا تو اس کے ایک ہیرو وہ بھی ہیں، وہ اس سفر میں بھی ایک شفیق عزیز کی طرح ملے، میری مشکلیں سن کر اپنے دفتر لے گئے، میری طرف سے ایک درخواست لکھی، ٹائپ کرائی، اور خود ایک عرضی گذار بن کر وزارت تعلیم کے سکریٹری کے سامنے جا کھڑے ہوئے، اور جو کچھ مجھکو کہنا چاہئے تھا، وہ سب کچھ کہہ گئے، اس کے بعد خوبی سے اس کام کا انجام پانا یقینی ہوگیا، وہ ہر مرحلہ میں میری دست گیری کرتے رہے، اُن سے مل کر باتیں کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا کہ قرون اولیٰ میں ایسے ہی اخلاقی اوصاف کے لوگوں کی وجہ سے مسلمانوں کے معاشرہ میں ہر قسم کی ترقی ہوتی رہی ہوگی،

اس کام میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر عبد الواحد ہالی پوتہ بھی میرے لئے فرشتۂ رحمت بنے رہے، وہ اپنی من موہنی باتوں سے دل اور دماغ دونوں کی تسخیر کرتے رہے، ان کی ضیافتوں سے محظوظ ہونے کے علاوہ اُن کی تواضع، کسر نفسی اور شرافت اخلاق کے بارے جھکا رہا، جب کبھی اُن سے کسی کام کے لئے کچھ عرض کیا تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ اپنے تمام اخلاق حسنہ کا سونا گھلا کر ہی دم لیں گے، ایسے ہی افراد کے نمونہ سے ایک اچھی قوم کا خمیر تیار ہوا کرتا ہے،

پروفیسر قدرت اللہ فاطمی اسلام آباد میں ترکی، ایران اور پاکستان کے علاقائی تعاون کے ثقافتی امور کے ڈائرکٹر ہیں، اُن کے نحیف جسم کے جس حصہ کو کھرچا جائے تو اس میں حرف علم ہی ملیگا، اُن کا دفتر میرے لئے گوشۂ عافیت بنا ہوا تھا، اُن کی مرنجاں مرنج علمی گفتگو سے ہوٹل قیام کا تکدر دور ہوتا رہتا، اُن کے گھر والوں کے ساتھ بیٹھنے میں اپنے ہی گھر کی لذت ملتی، اُن کے دفتر کے ٹیلیفون سے میری بہت سی مشکلیں آسان ہوئیں، ان کے دست راست خواجہ امین احمد صاحب نے ہر قسم کی دلجوئی کی۔

اسلام آباد کے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ریسرچ فیلو جناب محمود غازی اور اُن کے بھائی محمد غزالی نے اپنے عزیزانہ برتاؤ سے وہاں کے قیام کو خوشگوار بنائے رکھا، وہ مولانا اشرف علی تھانوی کے قریبی عزیز ہیں، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اڈیٹر فکر و نظر خاندانی طور پر اعظم گڑھ کے ہیں، اب پاکستانی ہیں، انھوں نے وہ سارے حقوق ادا کئے، جن کی توقع اُن سے ہو سکتی تھی، جناب حسان کلیمی صاحب سعودی عرب کے خاص نامہ نگار ہیں، وہ اپنی سیاسی معلومات سے محظوظ کرنے کے علاوہ کام و دہن کو بھی لذت آشنا کرتے رہے، اُن کے قہقہوں کی پریم بتیسی برابر یاد آئیگی، جناب بشیر احمد صاحب پہلے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں تھے، اب ایسوشی ایٹڈ پریس آف پاکستان کے سب سے بڑے عہدیدار ہیں، اُن کے مفید مشوروں سے بڑی مدد ملی۔

نیشنل بک فاؤنڈیشن سے جب معاہدہ ہوا تھا، تو اس وقت کے منیجنگ ڈائرکٹر جناب یونس سعید صاحب تھے، جن کی پوری ہمدردی شامل حال رہی، وہ شکر گذاری کے جذبہ کے ساتھ برابر یاد آتے رہیں گے، اب اُن کی جگہ پر جناب رضی الرحمن صاحب ہیں، جو پاکستان کے سول سروس کے بہت ہی لائق کارگذار اور دیانت دار افسر سمجھے جاتے ہیں، یہ تحریر لکھ رہا ہوں اور اُنکا حسن سلوک یاد آرہا ہے، جب معاہدہ کی دوسری قسط کی رقم وزارت تعلیم سے ملی تو انھوں نے اپنے دفتر میں ایک پرتکلف افطار پارٹی دی جس میں بہت سے معززین شریک ہوئے، ان سے آخری ملاقات اُن کے ایک قریبی عزیز کے ساتھ اسلام آباد کے ایک بہت ہی مشہور ہوٹل ہالی ڈے ان کے ایک ڈنر میں ختم ہوئی،

معاہدہ کی رقم کی ادائگی کے سارے مراحل اب ختم ہو گئے، اس نیک اور مفید کام میں مخلصانہ ابتدا کرنے کا سہرا جناب سید حسام الدین راشدی کے سر ہے، جو پاکستان کے بہت مشہور اہل علم ہونے کے ساتھ دارالمصنفین کے علمی کارناموں کے بے حد قدر داں ہیں، پاکستان کے ناشر دارالمصنفین کو جو نقصان

پہنچا رہے تھے، اس کے خلاف انھوں نے پاکستان کے سارے اخبارات میں ایک مہم چلائی، اُن کی آواز حکومت پاکستان کے ایوان میں بھی گونجی، اس کام کو انجام تک پہنچانے میں مولانا کوثر نیازی نے پوری دلچسپی لی، جو اس وقت حکومت پاکستان میں مذہبی امور کے وزیر تھے، ان ہی کی مساعی جمیلہ سے یہ مسئلہ سرکاری سطح پر پہنچ کر طے ہوا، وہ اب وزیر نہیں رہے لیکن احسان شناسی کا جذبہ یہ ہے کہ انھوں نے ہمارے ادارہ کے لئے جو حسنِ خدمت انجام دیا، اس کی یادیں یہاں کے لوگوں کے دلوں میں برابر باقی رہے، اسی جذبہ سے اسلام آباد میں ان سے ملاقاتیں کیں، پہلی دفعہ جب میں اُن کے بنگلے پر پہنچا تو دیکھتے ہی ننگے پاؤں اپنے ڈرائنگ روم سے باہر نکلے، اور کہنے لگے کہ یہ فقیر وزیر نہیں رہا لیکن علم دوست برابر رہیگا، اُن کی علم دوستی ضرور یاد آتی رہیگی، جب وہ وزیر تھے، تو اُن کی وزارت کے جوائنٹ سکریٹری جناب زاہد ملک تھے، اب وہ اسلام آباد میں نوائے وقت کے اڈیٹر ہیں، انھوں نے بھی معاہدہ کی تکمیل میں ہر طرح کی اعانت کی تھی، اُن سے ملا تو اپنی دیرینہ محبت کی لپک سے ملے، جس کے لئے اُن کا شکر گذار ہوں،

اسلام آباد میں مختلف اوقات میں قیام کی مدت تقریباً آٹھ مہینے رہی، وہاں اپنے ایک عزیز سید مصباح الہدیٰ بی ایس سی (علیگ) انفارمیشن افسر حکومت پاکستان کے ساتھ ٹھہرا، کسی کے یہاں طویل مدت تک مہمان ہونا سراسر زحمت ہی بننا ہے لیکن برادرم سید مصباح الہدیٰ اور اُن کے اہل وعیال نے کسی موقع پر یہ محسوس ہونے نہیں دیا، کہ میرا قیام اُن کے لئے بار ہے، یہ اُن کی میزبانی کی فراخ دلی اور بلند حوصلگی کا ثبوت ہے، اُن کے لڑکے عزیزی سید ضیاء الہدیٰ میری خدمت میں اس طرح لگے رہے جیسے اسی کی بدولت اُن کو سعادت دارین حاصل ہو گی۔ میں اس خاندان کا شکریہ دارالمصنفین کی طرف سے بھی ادا کرتا ہوں،

پاکستان کی حکومت سے جو رقم ملی اس کی باضابطہ اطلاع پاکستان میں اپنے سفارتخانہ میں بھی کی، اس سفر میں بہت سی علمی فتوحات بھی ہوئیں، جن کا ذکر آئندہ آئے گا،

مقالات

سلطنت اور دین کا تعلق

از

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

دنیا میں اس وقت دو قسم کے مذہب نظر آتے ہیں، ایک وہ جس میں سلطنت کو مذہب سے قطعاً علیحدہ رکھا گیا اور یہ کہا گیا ہے کہ جو قیصر کا ہو وہ قیصر کو دو، اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو[1] گویا اس تعلیم میں قیصر اور خدا کی دو متقابل ہستیاں فرض کی گئی ہیں، جن میں سے ایک کا حکم دوسرے سے بالکل الگ ہے یہی وہ اصول ہے جس کی سطح پر یورپ کی موجودہ سلطنتیں قائم ہوئی ہیں، اور جس کی بنا پر دین و دنیا کی دو علیحدہ حدیں بنائی گئی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہ سلطنتیں خدا پرستی، دین داری، صداقت اور اخلاص نیت کے ہر منظر سے عاری اور خالی ہیں،

سلطنتوں کی دوسری قسم وہ تھی، جس میں دین کی لطیف و نازک روح کو سلطنتی قوانین جیسی مضبوط رسیوں میں جکڑ دیا گیا تھا، جس سے مذہب کی لطافت جاتی رہی تھی اور رسوم و قوانین کی خشکی نے اس کی جگہ لے لی تھی، یہودیت اور برہمنیت اس کی بہترین مثالیں ہیں،

لیکن اصل دینِ الٰہی ایک ہی ہے، اور ایک رہا ہے، اور جو ازل سے ابد تک یکساں رہے گا، اور وہ اسلام ہے، إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (خدا کے نزدیک دین اسلام ہے) اس دین کی جامعیت

---

[1] انجیل،

کی تشریح مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے، اور کی جا سکتی ہے، انہی میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ سلطنت اور دین کا معتدل مجموعہ ہے، وہ ایسی سلطنت ہے جو ہمہ تن دین ہے یا یوں کہیے کہ ایسا دین ہے جو سرتاپا سلطنت ہے، مگر سلطنتِ الٰہی اس اجمال کی سب سے پہلی تفصیل یہ ہے کہ اس دینی سلطنت میں قیصر کا وجود نہیں، اس میں ایک ہی اصلی حاکم و آمر مانا گیا ہے، جو حاکم علی الاطلاق اور شہنشاہ قادرِ مطلق ہے، جلّ شانہ وتعالیٰ اسمہ "بادشاہی اسی کی ہے حکم اسی کا ہے، فرمان صرف اسی کا صادر ہوتا ہے، دنیا کے دوسرے مجازی حاکموں اور آمروں کا حکم اسی وقت مانا جا سکتا ہے جب وہ عین حکمِ الٰہی ہو، یا اس پر مبنی ہو، اور کم از کم یہ کہ اس کے مخالف نہ ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دین کے سب سے آخری داعی، نبی اور پیغمبر تھے، اور وہی اس کی اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر، حاکم، اور فرمانروا تھے، آپ کے احکام کی بجا آوری عین حکمِ خدا کی بجا آوری تھی،

وَمَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (نساء - ۱۱) — جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی

آپ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے آپ کے جو جانشین ہوئے، ان میں بھی دین و دنیا کی یہی جامعیت تھی، وہ جس طرح مسلمانوں کے امیر و حاکم اور ان کی سلطنت کے فرمانروا تھے، اسی طرح وہ دین کے پیشوا، امام اور مجتہد تھے، اور ان کے احکام کی تعمیل بھی عین خدا و رسول کے احکام کی تعمیل تھی، اور اب بھی اسی لئے مسلمان بادشاہوں کے وہ احکام جو خدا و رسول کے حکم کے خلاف نہ ہوں، ہر مسلمان پر واجب التعمیل ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں

من اطاع امیری فقد اطاعنی — جس نے میرے امیر کا کہا مانا، اس نے میرا کہا مانا

ومن عصیٰ امیری فقد عصانی[۱] — جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی۔

[۱] صحیح بخاری کتاب الاحکام جلد ۲ ص ۱۰۵۷، و صحیح مسلم کتاب الامارۃ جلد ۲ ص ۲۲۳ مصر

سلطنت اور دین کا یہ اتحاد اسلام کا سب سے بڑا نصب العین ہے، احکامِ الٰہی کے مطابق سلطنت کا جو کام بھی اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کی غرض سے کیا جائے، وہ عین دین اور عین عبادت ہے یہاں تک کہ امراء کا اپنی رعایا کی خدمت کرنا، اور رعایا کا اپنے امراء اور حکام کی اطاعت کرنا بھی اطاعتِ الٰہی ہے، بشرطیکہ دونوں کی نیت اور غرض اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجا لانا ہو، غرض اسلام کی نظر میں سلطنت اور دین میں تفریق کاموں کی نوعیت سے نہیں، بلکہ کاموں کی غرض و نیت سے ہے، خدا کے لئے اور خدا کی خوشنودی کے حصول کے لئے سیاست و سلطنت کے متعلقہ احکامِ الٰہی کا جو کام بھی کیا جائے، وہ دین ہے، امام کی امامت، خلیفہ کی خلافت، راعی کی رعایت، والی کی ولایت، امیر کی امارت، حاکم کی حکومت، رعایا کی نگرانی و پاسبانی، قاضی کی دادگستری، عمال کا عمل، سپاہی کا قتال، مجاہد کا جہاد، محصل کی ادائی، امراء کی و رعیت کی اطاعت غرض سلطنت کے تمام متعلقہ شعبوں میں سے جو کام بھی حسبِ احکامِ الٰہی اللہ کے لئے کیا جائے، وہ سب دین اور اطاعت اور موجبِ قربت ہے، سلاطین اگر اپنی سلطنت اور امراء اپنی امارت اور اسی طرح دوسرے مفوضہ خدمات کے ذمہ دار اگر اپنی ذمہ داریوں کو چھوڑ کر شب و روز کسی گوشہ میں بیٹھ کر صرف یادِ الٰہی میں ہی مصروف رہیں تو بھی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے فرائض سے غافل قرار پائیں گے، فرائض و مؤکدات کی بجا آوری کے بعد ان کی بہترین عبادت یہی قرار دی گئی ہے کہ وہ خلوص و اخلاص کے ساتھ اپنے مفوضہ فرائض کی بجا آوری میں مصروف رہیں، حضرت داؤد کا جو قصہ سورۂ ص میں ہے جس میں چند دادخواہوں کا دیوار پھاند کر حضرت داؤد علیہ السلام کے عبادت خانہ میں داخل ہو جانے اور ایک مقدمہ کے پیش کرنے کا ذکر ہے، قصہ خوانوں نے اس کو ایک بیہودہ کہانی بنا دیا ہے، حالانکہ وہ ان کی تنبیہ اس باب میں ہے کہ کہ خلیفہ کی سب سے بڑی عبادت فرائض کے بعد رعایا کی خدمت، ان کے معاملات کی دادرسی

اور اُن کے کاموں کی نگرانی ہے، اور یہی احساس فرض ہے، جس پر حضرت داؤد علیہ السلام متنبہ ہوئے،

وَظَنَّ دَاؤٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۝ (ص-۲)

اور داؤد نے سمجھا کہ ہم نے (یعنی خدا نے) اُن کو آزمایا ہے، تو اپنے پروردگار سے انھوں نے معافی چاہی، اور رکوع میں گر گئے، اور رجوع کیا، تو ہم نے ان کو معاف کر دیا اور اُن کو ہمارے ہاں قرب کا درجہ اور پھر آنے کی اچھی جگہ حاصل ہے، اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا، تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکم کرو، اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دے گا،

آگے پیچھے کی آیتوں کے درمیان ربط و نظم کا تناسب واضح کر رہا ہے کہ حضرت داؤدؑ سلطنت کے فرائض اور مقدمات کے فیصلوں میں مشغولی کے بجائے اپنے عبادتخانوں کے دروازہ کو بند کر کے خدا کی عبادت میں مصروف رہنے لگے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کو اس پر تنبیہ کی گئی اور بتایا گیا کہ خلافت کا فرض یہ ہے کہ احکامِ الٰہی کے تحت فرائضِ خلافت ہی میں مصروفیت رہے،

جامع ترمذی اور مستدرک حاکم میں ایک حدیث ہے، جو گویا اس آیت کی تفسیر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

ما من امام یغلق بابہ دون ذوی الحاجۃ والخلۃ والمسکنۃ الا اغلق اللہ ابواب السماء دون خلتہ وحاجتہ ومسکنتہ (ترمذی ابواب الاحکام ص۲۳۶)

جو امام و حاکم ضرورتمندوں سے اپنا دروازہ بند کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اُس کی ضرورت کے وقت آسمان کا دروازہ بند کر دے گا،

مَنْ وَلِیَ من امر المسلمین شیئًا فاحتجب دون خلتھم وحاجتھم وفقرھم وفاقتھم احتجب اللہ عز وجل یوم القیمۃ دون خلتہ وفاقتہ وفقرہ، (مستدرک حاکم کتاب الاحکام جلد ۴ ص ۹۳ حیدرآباد)

جو شخص مسلمانوں کے معاملہ کا ذمہ دار ہونے کے بعد اُن کی ضرورت کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُس کی ضرورت و احتیاج کے وقت اوٹ میں ہو جائیگا،

خلفائے راشدین نے ان احکام کی پیروی یہاں تک ... کی کہ انھوں نے اینٹ اور چونے کی کوئی چہار دیواری بھی اپنے لئے نہیں بنائی، اور اپنے حق طلب رعایا کے بیچ میں طلب اجازت حاصل کرنیوالے غلاموں[1] کے سوا کوئی اوٹ بھی قائم نہیں کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ

---

[1] چونکہ اسلام میں کسی کے مکان میں داخل ہونے کیلئے اذن کا حکم ہے اسلئے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، اور خلفا نے گھروں کے دروازوں پر اس کام کے لئے نوکر متعین کئے تھے مگر عام پبلک مقامات مساجد اور عدالت گاہوں میں نہ اس اجازت کی ضرورت ہے اور نہ ایسے پہرہ داروں کی،

کے زمانہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص نے جو کوفہ کے والی تھے، اپنے رہنے کے لئے ایک محل بنوایا، اور اس میں پھاٹک لگایا، تو جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے خاص طور سے مدینہ سے محمد بن مسلمہؓ کو اس لئے بھیجا کہ اس پھاٹک میں آگ لگا کر چلے آئیں چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا، وہ سیکڑوں میل کی مسافت طے کر کے وہاں گئے، اور پہونچنے کے ساتھ اس پھاٹک میں آگ لگا دی، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے ان کو اپنے پاس ٹھہرانا چاہا، اور زادِ راہ دینا چاہا، تو اس کو بھی قبول نہیں کیا، اور سیدھے مدینہ واپس چلے آئے،

(ابن حنبل جلد اص ۴۵ مصر)

حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں حملہ آوروں کے خوف سے جب محل میں لوگوں کی آمد و رفت پر روک قائم کی، اور ایک صحابی نے ان کو اس حکم نبوی سے باخبر کیا تو انھوں نے یہ تدبیر کی کہ ایک خاص آدمی پھاٹک پر اس غرض سے مقرر کیا جو اہلِ حاجت کی ضرورت کو سن کر اس سے ان کو مطلع کرتا، (ترمذی ابواب الاحکام)

قرآن پاک میں بار بار حکام کو عدل و انصاف اور اپنے ذمہ دارانہ فرائض کی بجا آوری کی تاکید کی گئی ہے، اور خصوصیت کے ساتھ ذیل کی آیتیں اپنے معنی کے عموم کے لحاظ سے فرائضِ حکومت کے مذہبی نقطۂ نظر کی پوری توضیح کرتی ہیں،

اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰی اَھْلِھَا	امانت والوں کی امانتیں اُن کے حوالے
وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ	کر دیا کرو، اور جب لوگوں میں فیصلہ
تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰہَ	کرنے لگو، تو انصاف سے فیصلہ کیا
نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ	کرو، خدا تمھیں بہت خوب نصیحت
سَمِیْعًا بَصِیْرًا ۝ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا	کرتا ہے، بیشک خدا سنتا اور

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ	دیکھتا ہے، مومنو! خدا اور اس کے
وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ	رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو لوگ
تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ	تم میں صاحبِ حکومت ہیں، اُن کی
اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ	بھی، اور اگر کسی بات میں تم میں
تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ	اختلاف واقع ہو تو اگر خدا اور
ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ۝	روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو
(نساء - ۸)	اس میں خدا اور اس کے رسول
	(کے حکم) کی طرف رجوع کرو، یہ
	بہت اچھی بات ہے، اور اس کا مآل
	بھی اچھا ہے،

یہ آیتیں اسلامی سلطنت کے آئین کے بیان میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی، آیتِ پاک کا پہلا ٹکڑا اپنے معنی کے اطلاق کے لحاظ سے اہلِ تفسیر کی تصریح کی بنا پر حکام تک وسیع ہے، اور یہ بات کہ ہر صاحبِ حق کو اس کا حق ادا کیا جائے، امانت کا اعلیٰ درجہ اور حکومت کا پہلا فرض ہے،

وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا	اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم
تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ، (رحمٰن - ۱)	کرو اور میزان میں کمی نہ کرو،

یہ اور اس معنی کی اور آیتیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ حقوق کی ادائگی میں پورا انصاف برتا جائے، اور جس پیمانہ سے تم دوسروں کے لئے تولتے ہو، اسی سے اپنے لئے بھی تولو،

وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا کَالُوْھُمْ اَوْ وَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ، (مطففین: ۱)

پھٹکار ہو ان تول میں بے ایمانی کرنے والوں پر جو لوگوں سے تول کر لیں تو پورا پورا لیں، اور جب ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا دیں،

یہ انصاف کے خلاف ہے، اور خلاف انصاف کرنے والا اللہ کی محبت سے محروم رہے گا، اس کے مستحق منصف ہی ہیں،

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۝ (مائدہ حجرات ۶)

اور اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،

اس آیت کی وسعت میں انصاف کرنے والوں کا ہر طبقہ داخل ہے،

اس کے برخلاف ارشاد ہے،

وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الظَّالِمِیْنَ ۝ (آل عمران ۶-۱۴)

اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا،

اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ (شوریٰ ۴)

بیشک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا،

"ظلم" کے معنی کسی دوسرے کے حق کو دبانے کے ہیں، چاہے وہ اپنے ہی نفس کا ہو، یا عام بندوں کا ہو، یا خدا تعالیٰ کا ہو، ان آیتوں سے مقصود یہ ہے کہ حکومت اور اس کے فرائض اسلام میں دین کی حیثیت رکھتے ہیں، جس سے بحسن خوبی عہدہ برآ ہونا ثواب اور اس میں قصور گناہ ہے، اور بحسن خوبی عہدہ برآ ہونا یہی ہے کہ وہ احکام الٰہی کے تحت ادا ہوں،

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (مائدہ ۷)

اور جو اللہ کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ کریں وہی نافرمان ہیں،

احادیث میں بھی اس کی تصریحات ہیں، ارشاد ہے،

اَلَا اَیُّھَا النَّاسُ لَا یَقْبَلُ اللّٰہُ صَلٰوۃَ اِمَامٍ حَکَمَ بِغَیْرِ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ، (مستدرک جلد ۴ ص۸۹ کتاب الاحکام)

ہاں اے لوگو! جو امام خدا کے قانون اتارا ہے، اس کو چھوڑ کر کچھ فیصلہ کرے اس کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں کریگا،

سبب ظاہر ہے کہ نماز بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور انقیاد کی تمثیل ہے، اب جو شخص ایک طرف اس کامل اطاعت اور انقیاد کا اظہار کرتا ہے، اور دوسری طرف اس کی صریح مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے، وہ ایک معنی میں منافق ہے، اور اس لئے اس کی نماز یعنی اظہار اطاعت بارگاہ الٰہی میں بے معنی ہے،

اسی سلسلہ میں ان حدیثوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جن سے یہ ظاہر ہوگا، کہ حکومت و فرمانروائی بھی ایک مذہبی فریضہ ہے، جو لوگ اس فریضہ سے حسب احکام الٰہی بخوبی عہدہ برآ ہوں، ان کے لئے رحمت الٰہی کا سایہ ہے، اور جو اس امتحان میں پورے نہ اتریں اُن کے لئے وہ سزائیں ہیں جو دوسری زندگی میں ان کے لئے مہیا ہیں، فرمایا،

اَلْاِمَامُ الَّذِیْ عَلَی النَّاسِ رَاعٍ وَھُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ (صحیح بخاری جلد ۲ ص۱۰۵۷ کتاب الاحکام)

وہ امام جو لوگوں پر مقرر ہے، وہ نگران کار ہے، اس سے اس کے زیر نگرانی اشخاص کے متعلق بازپرس ہوگی،

اس سے معلوم ہوا کہ امیر اور امام بڑی ذمہ داریوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں، اسلامی امارت و خلافت تاج و تخت کی بہار اور عیش و عشرت کا گلزار نہیں، وہ ہمہ تن ذمہ داریوں کا خارزار ہے، جو اس سے بسلامت گذر گیا، اس کے لئے دنیا کی سعادت، و نیک نامی اور آخرت کا ابدی آرام و آسائش ہے، اور جو اس میں الجھ کر رہ گیا، وہ اس دنیا میں بھی ناکام و بدنام اور آخرت میں بھی رسوا و خوار ہوگا،

ما من عبد یسترعیہ اللہ رعیۃ فلم	جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگراں
یحطھا بنصیحۃ الا لم یجد	بنائے اور وہ اس کی خیر خواہی پوری
رائحۃ الجنۃ،	پوری نہ کرے، تو وہ جنت کی بو بھی
(بخاری و مسلم حوالہ سابق)	نہ پائے گا،

حضرت معقل بن یسار ایک صحابی ہیں ان کے مرض الموت میں بصرہ کا سفاک امیر عبید اللہ بن زیاد ان کی عیادت کو آیا، انھوں نے امیر کو مخاطب کرکے فرمایا کہ آج میں تمھیں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک پیغام سنا دینا چاہتا ہوں، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری زندگی ابھی اور باقی ہے تو میں نہ سناتا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے،

ما من عبد یسترعیہ اللہ رعیۃ	جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا
یموت یوم یموت وھو	نگراں بنائے، وہ مرتے وقت اس
غاش لرعیتہ الا حرم اللہ	حال میں مرے کہ وہ اپنی رعیت
علیہ الجنۃ،	کے ساتھ غداری کرتا تھا تو اللہ
(مسلم کتاب الامارہ)	اس پر جنت کو حرام کر دے گا،

اس سے اندازہ ہوگا کہ امارت و حکومت کی ذمہ داری اسلام کی شریعت میں کتنی بڑی ہے،

ایک اور صحابی جن کا نام عائذ بن عمرو ہے رضی اللہ عنہ، وہ مرض الموت کا بھی انتظار نہیں کرتے عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں خود پہنچ جاتے ہیں، اور اس کو پیار سے خطاب کرکے کہتے ہیں اے بیٹے! میں نے رسول اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے،

ان شر الرعاء الحطمۃ،	سب سے برا راعی (امیر) وہ ہے جو اپنی
(مسلم کتاب الامارہ)	رعیت کو توڑ ڈالے،

تو تو ان میں سے نہ بن، اس نے کہا آپ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اصحاب میں بھوسی ہیں، فوراً بولے کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں کوئی بھوسی بھی تھا، بھوسی تو اوروں میں تھے، اور ان کے بعد والے ہیں،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء فرمایا کرتے تھے، ایک نبی گذر جاتا تھا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا تھا اور اب میرے بعد کوئی نبی نہیں، البتہ خلفاء ہوں گے، اور بہت ہوں گے، صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ تو آپ ہم کو کیا حکم دیتے ہیں، فرمایا، پہلے کی بیعت کرو، پھر اس کے بعد والے کی، ان کا حق ان کو ادا کیا کرو، (یعنی اپنے حق کی پرسش خدا پر چھوڑ دو)

فان اللہ سائلھم عما استرعاھم	کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے متعلق
(صحیح بخاری)	باز پرس فرمائے گا جتنی نگرانی ان کے
	سپرد فرمائی ہے،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے امراء کے حق میں یہ دعا فرمائی ہے جو یقین ہے کہ قرین اجابت ہوئی ہوگی،

اللھم من ولی من امر امتی	اے اللہ! جو کوئی میری امت کی
شیئاً فشق علیھم فاشقق	کسی بات کا (یا حکومت کے کسی حصہ
علیہ و من ولی من امر امتی	کا) بھی والی ہو اور وہ ان پر سختی
شیئاً فرفق بھم فارفق بہ	کرے، تو تو بھی اس پر سختی کرنا، اور
(مسلم)	جو ان سے مہربانی سے پیش آئے تو تو
	بھی اس پر مہربانی فرمانا،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ اپنی وسعت کے لحاظ سے بادشاہ سے لے کر ادنیٰ افراد تک کو محیط ہیں، اور ہر ایک پر اپنے اپنے دائرۂ حکومت کے مطابق ذمہ داری عائد ہے، ایک اور حدیث پاک میں اس دائرہ کی وسعت اور بھی نمایاں ہے،

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته والرجل راع علی اهل بیته وهو مسئول عنهم والمرأة راعیة علی بیت بعلها وولده وهی مسئولة عنهم والعبد راع علی مال سیده وهو مسئول عنه الا فکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته

(مسلم وصحیح بخاری)

ہاں! تم سب نگران کار ہو، اور تم سب سے اپنے زیر نگرانی اشخاص و رعایا کی بابت پوچھ ہوگی تو لوگوں کا امیر نگراں کار ہے اس کے زیر نگراں کے متعلق پرسش ہوگی، اور مرد اپنے گھر والوں کا نگران کار ہے اور اس سے اس کے گھر والوں کی پرسش کی جائے گی، اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بال بچوں کی نگراں ہے، اس سے اُن کے متعلق سوال ہوگا، اور غلام اپنے آقا کے مال کا نگراں ہے، اس سے اس کی بابت پوچھا جائے گا، تو ہاں! ہشیار رہو! تم سب نگران کار ہو اور تم سب سے اس کے زیر نگراں کے بابت بازپرس کی جائے گی،

لفظ رعیت

اس موقع پر ایک خالص لفظ کی تحقیق مناسب معلوم ہوتی ہے جو ہماری زبان میں عام طور پر رائج ہے، اور ذمہ داری کے لحاظ سے وہ اپنی حقیقت سے بالکل خالی ہوگئی ہے، ان حدیثوں میں لفظ راعی اور رعیت اور اس کے اشتقاقات بار بار آئے ہیں یہ الفاظ لفظ "رعی" سے نکلے ہیں جس کے اصل معنی جانوروں کے چرانے کے ہیں، راعی چرواہا ہوا اور رعیۃ وہ ہے جس کو وہ چرائے، اور جس کی وہ نگہبانی کرے، اس تمثیل سے ظاہر ہے کہ کسی کی رعیت وہ ہے جس کی تربیت و پرورش اور آسایش و نگرانی اور حفاظت کسی راعی و محافظ کے سپرد ہو، تو امیر کی حیثیت ایک شفیق و محافظ چرواہے کی ہے جو اپنے گلے کو سرسبز چراگاہوں میں لے جاتا، اور ان کی شکم سیری کا سامان کرتا ہے، اور درندوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے، اور ان کو بچاتا ہے، اس تشریح کے مطابق یہ غور طلب ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر لفظ "رعیت" کس قدر شفقت آمیز اور محبت کے معنوں میں تمثیلاً آیا ہے، اور ظالم و سفاک امرا اپنے عمل سے اس کو کتنے ذلیل اور پست معنوں میں عملاً استعمال کر رہے ہیں، حالانکہ تنہا اسی لفظ میں خود اُن کی ذمہ داریوں کا ایک بڑا دفتر پوشیدہ ہے جو امام عادل اپنے فرائض سے بخوبی عہدہ برآ ہوں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی نسبت یہ بشارت دی ہے،

ان المقسطین عند اللہ علی منابر من نور عن یمین الرحمن وکلتا یدیه یمین الذین یعدلون فی حکمهم واهلیهم وما ولوا،

(صحیح مسلم کتاب الامارہ)

بے شک انصاف کرنے والے حکام و امرا، اللہ تعالیٰ کے پاس نور کے منبروں پر اس کے داہنے ہاتھ پر ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں، جو اپنے فیصلہ میں اپنے لوگوں میں اور اپنے زیر حکومت لوگوں

اس رفعت اور بلندی سے جو ایسے عادل حاکموں، منصف امیروں اور سلطانوں کو قیامت کے روز حاصل ہوگی، ظاہر ہے کہ عادلانہ حکومت اور منصفانہ سلطنت کتنی بڑی عبادت کا درجہ رکھتا ہے؛ جامع ترمذی میں ہے،

ان احب الناس الی اللہ یوم	بے شبہ سب لوگوں سے خدا کو محبوب
القیامۃ وادناھم مجلسا	اور خدا سے قریب امام عادل ہوگا،
امام عادل وابغض الناس الی	اور خدا کے نزدیک سب سے مبغوض
اللہ وابعدھم منہ مجلسًا	اور خدا سے دور وہ امام ہوگا، جو
امام جائر (ترمذی ابواب الاحکام)	ظالم ہو،

اس کے برخلاف جو امام اور حاکم و امیر عدل و انصاف اور رعایا پروری اور خیر خواہی سے دور ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت سے بھی دور ہوں گے، فرمایا:-

ما من امیر یلی امر المسلمین	جو امیر مسلمانوں کے کام کا والی ہو،
ثم لا یجھد لھم الا لم یدخل	پھر وہ ان کے لئے محنت نہیں کرتا اور
معھم الجنۃ،	اور ان کا خیر خواہ نہیں، وہ اُن کے
(صحیح مسلم کتاب الامارۃ)	ساتھ بہشت میں داخل نہ ہوگا،
ما من وال یلی رعیۃ من	کوئی والی جو مسلمانوں کی کسی زیرنگرانی
المسلمین فیموت وَھُوَ	جماعت کا والی ہو وہ اس حال میں
غاش لھُم الا حرّم اللہ	مرے کہ وہ اُن مسلمانوں کے ساتھ
علیہ الجنۃ،	غداری کا مرتکب ہو، اوس پر جنت
(صحیح بخاری کتاب الاحکام)	حرام ہے،

انّما الامام جنۃ یقاتل	امام ڈھال ہے اس کے پیچھے اس کی پناہ
من ورائہ ویتقی بہ فان	میں لڑا جاتا ہے تو اگر وہ اللہ تعالیٰ کے
امر بتقوی اللہ وعدل فان	تقوی کے مطابق حکم کرے اور عدل کرے
لہ بذالک اجرًا وان امر	تو اس کو اس کا بڑا انعام ملے گا، اور
بغیرہ فان علیہ وزرًا	اگر غیر تقوی کا حکم کرے اور عدل نہ
(نسائی کتاب البیعۃ)	کرے تو اس کے لئے بڑی سزا ہے،

یہ حدیثیں اس بات کے ثبوت میں ہیں کہ اسلام میں حکومت و ریاست اور سلطنت و ولایت بھی امور دین کا درجہ رکھتے ہیں اور وہ بھی ثواب و معصیت اور جزا و سزا سے اسی طرح متصف ہوتے ہیں، جس طرح مسلمانوں کے دوسرے اعمال، اور وہ بھی ایک مسلمان کے سامنے جنت یا دوزخ کا دروازہ کھولنے میں اعمال و عبادات کے دوسرے شعبوں سے کم نہیں اور اس سے ثابت ہوگا کہ اسلام کی شریعت میں یہ دین کا ایک حصہ ہیں، کیونکہ یہاں دین کے معنی احکام الٰہی ہیں، یا قوانین الٰہی ہیں، یہ احکام الٰہی اور قوانین الٰہی انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے یکساں متعلق ہیں، اس بناپر سلطنت و ولایت و حکومت و ریاست کے کاروبار کا نظم ونسق اور انجام و اہتمام بھی دین ہی کا ایک گوشہ ہے اور اہم گوشہ،

ایک مدت سے علماء کی گوشہ گیری اور صوفیہ کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ قیام سلطنت اور امور سلطنت میں دخل و تدبیر دنیا کا کام ہے، جس سے اہل اتقا کو الگ تھلگ رہنا چاہئے،

گدائے[1] گوشہ نشینی تو حافظا مخروش ‏ رموز مملکت خویش خسرواں دانند

---

[1] حاشیہ ص آیندہ پر ملاحظہ ہو،

لیکن اسلام اس خسروی کا قائل نہیں، اس کی نگاہ میں سلطنت احکام الٰہی کی تبلیغ، تنفیذ اور اجراء کا کام ہے، اور یہ عین دین ہے، اسلام میں جس قتال و جہاد کی دعوت برملا دی گئی ہے اور جس پر اُخروی نعمتوں کے بڑے بڑے وعدے اللہ تعالٰی نے فرمائے ہیں، اور جس سے داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ مقدس اور حضرات خلفائے راشدین اور صحابہ کرامؓ کی زندگیاں سرتاپا معمور ہیں کیا اس سے مقصود بجز احکام الٰہی کی تبلیغ و تنفیذ اور اجراء تھا، جہاد سے فرار پر غضب الٰہی اور جہنم کی وعید ہے، اور میدان جہاد کے صبر و ثبات پر صادق قدم اور متقی ہونے کی بشارت بتصریح وارد ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ
الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ
الْأَدْبَارَ ۝ وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ
دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ
مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ
بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ
جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝
(انفال - ۲)

اے اہل ایمان جب میدانِ جنگ
میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان
سے پیٹھ نہ پھیرنا، اور جو شخص جنگ
کے روز اس صورت کے سوا لڑائی
کے لئے کنارے کنارے چلے، (یعنی
حکمت عملی سے دشمن کو مارے) یا اپنی
فوج میں جا ملنا چاہے ان سے پیٹھ
پھیرے گا، تو (سمجھو کہ) وہ خدا کے
غضب میں گرفتار ہوگیا، اور اس کا
ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے،

(حاشیہ ص ۳۳۹) لہ حافظ علیہ الرحمہ کے اس شعر کا یہ محمل بھی ہو سکتا ہے کہ بندہ کو اللہ تعالٰی کے احکام کے اسرار و مصالح کی تلاش نہیں کرنی چاہیئے جیسے دنیا کے بادشاہ اپنے رموز و مصالح سے غیروں کو آگاہ نہیں کرتے، اور اگر کوئی بشاء کی مرضی کے خلاف ان کے جاننے کی کوشش کرے تو وہ سزا کا مستوجب قرار پائے، اسی طرح اللہ تعالٰی کی تعلیم کے بغیر اپنی طرف سے احکام الٰہی کے رموز و اسرار کی تلاش و طلب نہیں کرنی چاہیئے،

وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ
وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ
صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ
(البقرہ - ۲۲)

اور سختی اور تکلیف میں اور معرکہ کارزار
کے وقت ثابت قدم رہیں، یہی لوگ
ہیں جو ایمان میں سچے ہیں، اور یہی ہیں
جو خدا سے ڈرنے والے ہیں،

یہی سبب ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جہاد و قتال فی سبیل اللہ، انصاف، اقامتِ دین، تنفیذ حکم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تمام کاروبار کو جس کا بڑا حصہ امامت خلافت اور اس کے ماتحت شعبوں اور صیغوں سے متعلق ہے، اہمیت میں عام عبادات و اعمالِ صالحہ سے کم نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ہو سکتا ہے کہ اقامت دین کی راہ میں شہادت کا ایک قطرہ مومن کے اعمالنامہ اور گناہوں کے دفتر کو دم کے دم میں دھو دے، اسی لئے حضرات صحابہؓ اس قتال دین کے مشتاق اور اس راہ میں شہادت کے طالب رہتے تھے،

فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا
مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي
سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا
لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ
وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي
مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِنْ
عِنْدِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ
الثَّوَابِ ۝ (آل عمران - ۲۰)

تو جو لوگ میرے لئے وطن چھوڑ گئے
اور اپنے گھروں سے نکالے گئے، اور
ستائے گئے، اور لڑے اور قتل کئے گئے
میں ان کے گناہ دور کر دوں گا
اور ان کو بہشتوں میں داخل کرونگا
جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (یہ)
خدا کے ہاں سے بدلہ ہے، اور خدا کے
یہاں اچھا بدلہ ہے،

خود لفظ دین قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے، ان میں سے ایک معنی احکام الٰہی کی

اطاعت تنفیذ اور اقامت کے بھی ہیں، سورۂ نور میں ہے،

وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ (نور-۱)
اور ان دونوں مجرموں کے ساتھ اللہ کے دین میں تم کو رحم نہ آئے،

کھلی بات ہے کہ اللہ کے دین" سے مقصود یہاں احکام الٰہی کی تنفیذ و اجراء سے ہے، اسی طرح سورۂ بقرہ کی اس آیت میں،

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (بقرہ-۲۴)
اور اُن سے اس وقت تک قتال کرتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے،

صرف حکم الٰہی کی اطاعت کو "دین" فرمایا گیا ہے، سورۂ انفال کی اس آیت میں:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (انفال-۴)
اور اُن لوگوں سے قتال کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ (کفر کا فساد) باقی نہ رہے اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے،

بھی حکم و قانون الٰہی کی تسلیم و اطاعت ہی کو دین فرمایا گیا ہے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی اطاعت کے لائق ہے، اور نہ عبادت کے، اسی کا ایک فیصلہ ہے، جو آسمان سے زمین تک جاری ہے، اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (انعام، یوسف) اَلَا لَهُ الْحُكْمُ (انعام) ایک اور آیت میں ارشاد ہے

وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا (نحل-۷)
اور اسی خدا کا ہے، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اسی کی لازمی اطاعت ہے،

یہاں بھی دین کے معنی احکام الٰہی کی اطاعت ہی کے زیادہ موزوں اور نظم قرآنی کے مطابق ہے،

سلطنت و ملکیت کی حقیقت

اب دین کی تشریح کے بعد حکومت و سلطنت و ولایت کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے، عام لوگ حکومت و سلطنت کو عیش و تنعم کے ایوانوں، زرنگار تاج اور زمردین تخت کی روشنی اور زرین کمربند غلاموں کے جھرمٹ میں تلاش کرتے ہونگے، یا جلال و جبروت اور قہر و ہیبت کی تلواروں کے سایہ میں، لیکن اسلام نے حکومت کی جو تعلیم دی ہے، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تعلیم الٰہی کی جو عملی مثال پیش کی ہے، وہ ان مناظر سے قطعاً خالی ہے۔

اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کردیے

سلطنت و حکومت اور ولایت و ریاست کا یہ رائج الوقت تخیل جس کی مثال سے دنیا کبھی خالی نہیں رہی ہے، اسلام کے قانون میں اصلاً نہیں ہے، بلکہ اسلام نے سلطنت، حکومت اور بادشاہی و شہنشاہی کے ان الفاظ کو بھی جو ہر زبان میں رائج تھے، قطعاً چھوڑ دیا، سب سے عام لفظ ملک کا تھا، اور اس سے اونچا لفظ شہنشاہ کا تھا، اور ایران کے شہنشاہ کسریٰ، اور روم کے امپر قیصر کہلاتے تھے، مگر تعلیم محمدیؐ نے ان سب لفظوں سے جو جبر و قہر اور ظلم و ستم کے ذہنی تلازم سے معمور ہو چکے تھے، پرہیز کیا، الملک کے ماخذ میں ملکیت اور مالکیت کا تصور ہے، جو اسلامی عقیدہ کے سراسر منافی ہے، اسلام کی تعلیم میں مالک حقیقی اور بادشاہ تحقیقی اللہ تعالیٰ ہے، اس لئے الملک ہونے کا استحقاق اسی کو ہے، چنانچہ قرآن پاک میں یہ وصف اللہ تعالیٰ کا بار بار بیان ہوا ہے،

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ (النّاس-۱)
کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں، لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی، لوگوں کے معبود برحق کی،

اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ (حشر: ۳)
بادشاہ حقیقی، پاک ذات (ہر عیب سے) امن امان والا،

فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ — تو خدا جو سچا بادشاہ ہے،

(مومنون: ۶)

الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ الْعَزِيزِ — بادشاہ حقیقی، پاک ذات، زبردست

الْحَكِيمِ ۝ (جمعہ: ۱) — حکمت والا،

یہ آیت قرآن پاک میں چھ مرتبہ آئی ہے، اور اس میں اللہ تعالیٰ ہی کو المَلِک الحق یعنی بادشاہ برحق فرمایا گیا ہے، ان تمام آیتوں میں ایک خاص نکتہ لحاظ کے قابل ہے، ان آیتوں میں کہیں ایک جگہ بھی اللہ تعالیٰ کو تنہا اَلْمَلِک یعنی بادشاہ نہیں کہا گیا ہے، بلکہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی مزید صفت ضرور لگائی گئی ہے، مثلاً پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کو مَلِکِ النَّاس "لوگوں کا بادشاہ" کہا گیا تو ساتھ ہی اس سے پہلے رَبِّ النَّاس "لوگوں کے پالن ہار" بھی کہہ دیا گیا ہے تاکہ اس کی رحمت و ربوبیت کا اظہار ہو، دوسری آیت میں اَلْمَلِک (بادشاہ) کے ساتھ اول اَلْقُدُّوْس (مقدس و پاک) اور پھر السَّلَام (امن و امان والا) کہا گیا تاکہ اس کی پاکی و بامنی بھی ظاہر ہو جائے، چوتھی آیت میں بھی اسی طرح اَلْمَلِک کے ساتھ اَلْقُدُّوْس (مقدس پاک) کا وصف شریک ہے، اور تیسری آیت میں الملک کے ساتھ (اَلْحَقّ) (برحق) کا وصف بھی اضافہ ہے، ان تمام احتیاطوں سے یہ ظاہر ہے کہ اَلْمَلِک کے لفظ کے اندر ایک تاریخی ظلم و سفاکی اور قہر و جبر بیرحمی اور دعوائے باطل کا ایسا مفہوم ذہن انسانی میں لازم ہو گیا تھا کہ کسی نئے وصف کے بڑھائے بغیر اس مفہوم کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں جہاں اپنے لئے اس لفظ کا استعمال کیا اس کے لوازم ذہنی کا استدراک فرور فرما دیا،

لفظ ملک الملوک کی ممانعت عربی میں ملک الاملاک یا ملک الملوک اور فارسی میں شاہنشاہ یعنی

شاہ شاہاں بولا جاتا تھا، اور اس کا تصور بادشاہوں کے تعلق سے ہر زبان میں مبالغہ یا واقعی دعوی کی صورت میں پایا جاتا ہے، اسلام میں شاہِ شاہاں یا شہنشاہ ملک الملوک صرف ایک ہی ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف ارشاد فرمایا،

ان اخنع الاسماء عند اللہ رجل تسمی ملک الاملاک (صحیح بخاری کتاب الادب)

سب سے بدتر نام اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو شہنشاہ کہے،

راجہ جے سنگھ کی رصدگاہیں[1]

از

جناب شبیر احمد خان غوری ایم اے۔ ایل ایل بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

یہ نام ہے مشہور فاضل علم الہیئت جی۔ آر۔ کے کی کتاب کا جو اُس نے راجہ جے سنگھ سوائی کی قائم کردہ رصدگاہوں کے حالات پر لکھی ہے، اُس سے پہلے اور فضلاء نے بھی اس موضوع پر خامہ فرسائی کی تھی[2]، جس کا تذکرہ موجب تطویل ہوگا، مگر کے اسٹرونومیکل سوسائٹی لندن کا فیلو ہونے کی بنا پر علم الہیئت کے نظری و عملی دونوں شعبوں میں دستگاہ عالی رکھتا تھا، نیز ملکی رصدگاہوں کے ارصادی اعمال کی جزئیات اور اُن میں استعمال ہونے والے آلات کی تیاری اور استعمال کے اُصول اور تکنیک کا واقف کار تھا، اس لئے ان رصدگاہوں کی کیفیت قلمبند کرنے کے باب میں موزوں ترین فاضل تھا۔

کے نے یہ کتاب ۱۹۱۸ء میں لکھی تھی، اور حکومت کے شعبۂ آثار قدیمہ نے اسے آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا کی سیریز میں شامل کر لیا[3]، مگر اپنی تحقیق اور افادیت کی بنا پر اس کا پہلا ایڈیشن

---

[1] Kaye, G.R.: The Astronomical Observatories of Jai Singh. Archaeological Survey of India, New Imperial Series Vol. 40.

[2] میرے پیش نظر اس کتاب کا وہ ایڈیشن ہے جسے [illegible] میں انڈولوجیکل بک ہاؤس وارانسی نے شایع کیا ہے، آئندہ اس کتاب کا حوالہ صرف مصنف کے نام (Kaye) سے دیا جائیگا۔

[3] G.R. Kaye: P 47-48

جو گورنمنٹ پرنٹنگ آفس کلکتہ سے شائع ہوا تھا، جلد ہی ختم ہوگیا۔ دوسرا ایڈیشن انڈولوجیکل بک ہاؤس وارانسی نے ۱۹۷۳ء میں شائع کیا ہے،

کتاب میں چودہ باب ہیں، پانچ باب (یعنی ساتواں، آٹھواں، نواں، دسواں اور گیارھواں) راجہ جے سنگھ کی تعمیر کردہ رصدگاہوں کے حالات پر ہیں، جو اس نے دہلی، جے پور، اُجین، بنارس اور متھرا میں قائم کی تھیں، چار باب (یعنی تیسرا چوتھا، پانچواں اور چھٹا) آلات رصدیہ پر ہیں، پہلے دو باب تمہیدی ہیں، اور آخری تین (یعنی بارھواں، تیرھواں اور چودھواں) اختتامی ہیں، جن میں راجہ کی ہیئتی سرگرمیوں کا پس منظر بیان کرنے کے علاوہ اُس کی کاوشوں پر تبصرہ بھی کیا ہے،

چراغ سے چراغ جلتا آیا ہے، یہ سنت دیرینۂ روزگار ہے، اور راجہ جے سنگھ کا ہیئتی فضل و کمال بھی اپنے پیشرووں کی علمی کاوشوں کی خوشہ چینی کا رہین منت تھا، لیکن ان ماخذ و مصادر کی نشاندہی میں احقاق حق سے زیادہ جذباتیت اور اس جذباتیت کو گرمانے کے لیے سیاسی مصلحت کوشی کارفرما رہی ہے، جیسا کہ کے لکھتا ہے،

"ان عوامل و موثرات کے باب میں ذرا سا بھی شک نہیں ہے جنھوں نے اُسکی (راجہ جے سنگھ کی) ہیئتی سرگرمیوں کا رخ متعین کیا، یہ الغ بیگ جیسے مسلمان ہیئت دانوں کے اثرات تھے، مگر عوامی طور سے ابھی تک یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر پورے طور پر نہیں تو کم از کم اصولی طور پر اسکی کاوشیں ہندو اصل ہیئت سے ماخوذ ہیں، اور سابق مصنفین نے اس خیال کو مستحکم بنانے میں بہت زیادہ مدد دی ہے"[1]

ان مصنفین سابقین میں اُس نے سر ولیم جونز، ولیم ہنٹر اور گیرٹ کا خصوصیت سے

---

[1] کے: جے سنگھ کی رصدگاہیں، ص ۶۹

نام لیا ہے، (اس کی تفصیل آگے آرہی ہے)

مگر فاضل مصنف نظری و عملی علم الہیئت کے علاوہ اس کی تاریخ بالخصوص ہندو علم الہیئت کی تاریخ پر بھی بڑی گہری نظر رکھتا ہے۔ اسی لئے اس نے ان مصنفین سابقین کی پیدا کی ہوئی خوش فہمیوں اور مبالغہ آرائیوں کے ساتھ خود کو متفق بنانے میں بڑی الجھن محسوس کی، جس کی وجہ سے اس کی اس کاوش کے منظر عام پر آنے میں تاخیر ہوئی، اس کی معذرت میں وہ اس خوش فہمی کی تغلیط کرتا ہے،

" یہ مروجہ خیال غلط ہے، (جس کی وجہ سے مصنف کو اپنی تصنیف کے پچھلے حصہ کو مرتب کرنے میں دقت پیش آئی) کہ راجہ جے سنگھ کی ہیئتی سرگرمیوں کا تذکرہ ہندو علم الہیئت کی تاریخ کے ساتھ چولی دامن کا تعلق رکھتا ہے۔"[5]

اور اگرچہ اس کی حتمی رائے تو یہی ہے کہ

" یہ مفروضہ کہ اس نے (راجہ جے سنگھ نے) اپنے مخصوص ہیئتی تصورات ہندو روایات سے اخذ کئے تھے، مکمل طور پر ساقط الاعتبار ہو چکا ہے۔"[6]

پھر بھی اس نے اتمام حجت کے لیے جہاں علم الہیئت میں راجہ کے ماخذ و مصادر کا جائزہ مرتب کیا ہے، ہندو ہیئتی روایات کے ساتھ اس کے ممکنہ تعلقات کا بھی بڑی دقت نظر سے تجزیہ کیا ہے، چنانچہ وہ اس مسئلہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے۔

" یہ انتہائی ضروری ہے کہ نہ صرف راجہ کے نظریات و اعمال کے صحیح ماخذوں کا

---

۵ کے دیباچہ ص اول ۶ Kaye: p. 89.

The Hypothesis that he received his main astronomical Inspirations from Hindu Tradition is completely eliminated."

پتہ چلایا جائے، بلکہ ان کے ممکنہ تعلقات پر بھی ذرا تفصیل کے ساتھ نظر ڈالی جائے جو اس کی کاوشوں اور روایتی ہندو نظریات و اعمال کے درمیان ہو سکتے ہیں۔"[1]

فاضل مصنف کے خیال میں یہ ماخذ و مصادر تین ہیں، چنانچہ وہ آگے چل کر لکھتا ہے۔

" مسئلہ کی توضیح کے لئے آسان طریقہ کار یہ ہوگا کہ علم الہیئت کے تین مکاتب یعنی (۱) ہندو، (۲) مسلم اور (۳) یورپی مکاتب، کے اثرات پر کلام کیا جائے، ایک حد تک راجہ جے سنگھ کا ان سب سے تعلق رہا تھا، اور اس کی کاوشوں پر ان کے اثرات کی کمیت اور کیفیت کا اندازہ لگانا بڑا دلچسپ مشغلہ ہوگا۔"[2]

ان تین ماخذوں میں سے ہندو ماخذ پر جس کی تاریخ کا وہ ماہر خصوصی ہے، اس نے بڑی گہری نظر ڈالی ہے، اسلامی علم الہیئت کے باب میں اس کا اعتماد یا تو موسیو سدیو کی فاضلانہ تصانیف پر تھا، یا پروفیسر عبدالرحمن اور فضل الہی صاحبان کی رہنمائی پر، اس لئے اس نے اس باب میں نتیجہ تو صحیح ہی نکالا ہے کہ

" اس باب میں ذرا سے شک و شبہ کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ جس مخصوص عامل نے اس کی ہیئتی سرگرمیوں کا رخ متعین کیا، وہ الغ بیگ جیسے مسلمان ہیئت دانوں کا تتبع تھا۔"[3]

---

۱ کے، صفحہ ۳ ۲ کے، صفحہ ۳ ۳ Kaye: p. 69.

"There is not the slighest doubt as to the main influence that directed his activities. It was that of the Muslim astronomers of the type of Ulugh Beg."

مگر اسلامی علم الہیئت کے ارتقا کی تاریخ کے باب میں اُس کی معلومات بس واجبی ہی تھیں، اس کے نتیجہ میں اُس سے بڑے بڑے مضحکہ خیز تسامحات ہوئے ہیں جسکی ذمہ داری خدا جانے اُس کے سمجھنے پر ہے، یا اس کے رہنماؤں کے سمجھانے پر یا خود ان رہنماؤں کے اپنے سمجھنے پر۔

اور جہاں تک راجہ جے سنگھ کی ہیئتی سرگرمیوں پر یورپی مکتب (جدید علم الہیئت) کے اثرات کا تعلق ہے، فاضل مصنف اس کے اندر یقیناً تجرد تبحر رکھتا ہوگا، مگر راجہ جے سنگھ کے یہاں ان اثرات کی نشاندہی کے باب میں اس موضوع پر لکھنے والے دوسرے محققین کی طرح وہ بھی قطعاً ناکام رہا ہے، جس کی وجہ "زیج محمد شاہی" کے بالاستقصار مطالعہ کا فقدان ہے، کیونکہ ان حضرات کی قیاس آرائیاں صرف دیباچہ ہی تک محدود رہی ہیں، جس کا انگریزی ترجمہ موجود تھا، اس کوتاہی مطالعہ کو سابق مصنفین نے مسئلہ کے اس پہلو سے مکمل بے اعتنائی کے ذریعہ اور فاضل مصنف نے عجیب وغریب توجیہات کے ذریعہ چھپانے کی کوشش کی ہے،

ذیل میں اسی اجمال کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے،

(الف) جے سنگھ کا ہندو ماخذ

جے سنگھ ہندو تھا اور جیسا کہ اُس کی سوانح حیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے ایک راسخ العقیدہ ہندو، بلکہ سیاست میں احیائیت پسند، اس لئے اس کی تعلیم وتربیت ہندو انداز پر ہوئی، اور اُس نے مختلف ہندو علوم کا مطالعہ کیا، اور چونکہ مذہب پسندی اُس کے مزاج میں راسخ تھی، اور وہ مختلف مذہبی مراسم کو اُن کے صحیح وقت پر ادا کرنے کی اہمیت کا قائل تھا، اس لیے "وقت شناسی" کے بنیادی اُصول یعنی علم الہیئت کی طرف، اُس نے ہندو نقطۂ نظر سے توجہ کی ہوگی، لہٰذا فطرتاً ہندو ریاضی وہیئت میں دستگاہ عالی حاصل

کی ہوگی، اس مقصد سے اُس نے ان علوم کی متداول کتابوں کا جنھیں وہ دیباچہ میں کتاب ہائے ہندی' کہتا ہے، مطالعہ کیا، مگر وہ ان کی افادیت سے مطمئن نہ ہو سکا، چنانچہ جیوریچ ایم مورلیس کا کہنا ہے ا۔

"ہیئتی معلومات کی تلاش وجستجو میں روایتی ہندو نظام ہیئت (جس کے نمائندہ شاہکار سوریہ سدھانت کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ بہت ہی قدیم زمانہ میں مرتب ہوا تھا) اسکے دقت پسند معیار کو مطمئن نہ کر سکا، کیونکہ اُسے اس میں وہ صحیح شہاداتی معطیات نہیں مل سکے جن کی اُسے تلاش تھی، لہٰذا اس کوتاہی کی تلافی کے لیے اُس نے مسلمانوں کی ہیئتی تصانیف کی طرف توجہ مبذول کی"[1]

اور جب اسلامی ریاضی وہیئت کے شاہکاروں کا روایتی ہندو نجوم وجوتش کی متداول کتابوں ("کتاب ہائے ہندی") سے مقابلہ کیا ہوگا، تو احساس کمتری کے زیر اثر اول الذکر کے ساتھ جن کا اُس نے نام بنام ذکر کیا ہے، ان "کتابہائے ہندی" کا نام لینے میں شرم محسوس کی، ویسے ان "کتابہائے ہندی" کے نام سے یہ بات تو پایۂ ثبوت کو پہونچ ہی جاتی ہے کہ راجہ جے سنگھ نے ہندو علم الہیئت کی متداول کتابیں ضرور پڑھی تھیں، البتہ تحقیق طلب بات یہ ہے کہ اُس نے ان "کتاب ہائے ہندی" کو درخور اعتنا سمجھا یا نہیں، اگر نہیں سمجھا تو کیوں؟ آیا وہ درخور اعتنا ہی نہیں تھیں، یا اور کوئی امر مانع تھا، اور اگر درخور اعتنا سمجھا تو کہاں تک اور کس طرح؟ اس طرح تحقیق طلب مسئلے دو ہیں۔

(۱) ہندو ہیئتی ورثہ کی نوعیت، اور

---

[1] Moraes, G.M. Astronomical Missions to The court of jaipur" JBBRAS, 1951, 27, P.63

(۳) راجہ جے سنگھ کی قدیم روایتی ہندو علم الہیئت سے اثر پذیری۔

دوسرے مسئلہ کے سلسلہ میں فاضل مصنف (جی۔ آر کے) نے "سابق مصنفین کی کوششوں" کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے بقول اُس کے اس غلط فہمی کی اشاعت میں مدد دی ہے کہ راجہ جے سنگھ کی ہیئتی کاوشیں ہندو اصل سے ماخوذ تھیں۔ لہٰذا مذکورالصدر مسائل کی تحقیق سے پہلے ان مصنفین سابقین کی تحقیقی مساعی پر ایک نظر ڈال لینا مستحسن ہوگا۔

مصنفین سابقین کی گلفشانیاں انیسویں صدی مسیحی میں جب کہ اسلامی دنیا عام زوال و انحلال کا شکار تھی، مغربی استعمار اپنے مخصوص سیاسی مصالح کے پیش نظر اسے اپنے مکروہ و مسموم پروپگنڈے سے مزید مضمحل بنانے میں کوشاں تھا، اس مقصد کے حصول کے لئے اس خیر الامم کے

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں   اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

کے مصداق افراد کو اپنے ماضی سے متنفر بنانے کی کوشش شروع کی گئی، اس کیلئے اُسکے ماضی کی سیاسی عظمت کو کچھ جابرۂ روزگار کی سفاکی و بہیمیت اور کچھ دوسرے عیاش حکمرانوں کی عیش پرستی کے افسانوں میں بدل دیا گیا، اور اس کی تہذیبی سربلندی اور ثقافتی درخشانی و تابناکی کو کچھ لال بجھکڑوں کی دقیانوسیت" بتایا گیا، اس طرح اس خیر الامم کا رشتہ اپنے ماضی سے منقطع ہونے لگا۔

ادھر ان میں مزید احساس کمتری پیدا کرنے کے لیے ان کے حریفوں کے ماضی کی عظمت و قدامت میں مبالغہ طرازی کے لیے بڑے دلچسپ افسانے گڑھے گئے، ان کے ثقافتی ماضی کو ہزاروں سے بڑھا کر لاکھوں سال پرانا بنا دیا اور دنیائے علم و حکمت کی عظیم ترین دریافتیں ان کے اسلاف کے کھاتے میں درج کر دیں۔

انیسویں صدی کے مستشرقین کی تحقیقات علمیہ کا محرک یہی جذبہ تھا، اس کی داستان دراز ہے، اس کے ہیروؤں کی فہرست بڑی طویل ہے، مگر پیش نظر بحث کے نقطۂ نظر سے کچھ یورپی فضلاء کی یہ نام نہاد تحقیقی کاوشیں ہماری توجہ کی خصوصیت سے مستحق ہیں، فاضل مصنف نے لکھا ہے:۔

"اس عوامی خوش فہمی کو کہ راجہ جے سنگھ کی ہیئتی مساعی ہندو اصل سے ماخوذ تھیں، مصنفین سابقین نے مستحکم بنانے میں بڑی مدد کی ہے۔"[۱]

ان مصنفین سابقین میں اُس نے سرفہرست گیرٹ (Garrett) کا نام لیا ہے، جس نے پنڈت چندردھر کے ساتھ مل کر رصد گاہ جے پور پر ایک کتاب بعنوان ....
"The Jaipur Observatory And its Builder"
لکھی تھی، وہ اپنی تصنیف میں سمراٹھ سدھانت نامی سنسکرت کتاب کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ کتاب جے سنگھ کے مخصوص ہیئتی اذکار و آراء پر مشتمل ہے، وہ اس بات کو کچھ ایسے انداز میں بیان کرتا ہے، جس سے مترشح ہوتا ہے، کہ یہ یا تو خود راجہ جے سنگھ کی تصنیف ہے یا پھر اس شخص (جگنناتھ پنڈت) کی طبعزاد ہے، جس نے اسے راجہ جے سنگھ کے لئے لکھا تھا،[۲] گیرٹ کی یہ کتاب عملی طور پر جے سنگھ کو "المجسطی" کا مصنف بنا دیتی ہے، اور ہندوؤں کو اسطرلاب کا موجد۔ اس سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ جے سنگھ کا یہ مزعومہ شاہکار ("سمراٹھ سدھانت") مکمل طور پر ہندو اصل سے ماخوذ تھا، اس کا کہنا ہے کہ جے سنگھ نے ہندو علم الہیئت کی تجدید کی اور اپنے نفسِ گرم کی تاثیر سے اُس کے مطالعہ کو وہ اہمیت بخشی جو برہم گپتا کے زمانہ (ساتویں صدی) سے دیکھنے میں نہیں آئی تھی،[۳]

---

[۱] کے، صفحہ ۶۹۔ [۲] کے، صفحہ ۶۹ [۳] ایضاً

مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ "سمراٹ سدھانت" بطلیموس کی "کتاب المجسطی" کا آزاد ترجمہ ہے جسے راجہ جے سنگھ کے دست راست جگناتھ پنڈت نے عربی سے سنسکرت میں منتقل کیا تھا، علم الہیئت کی تاریخ میں "المجسطی" کی اہمیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، مغل عہد بالخصوص سترہویں اٹھارویں صدی مسیحی میں یہ ہندوستان کے عربی مدارس میں ہیئت کے اعلیٰ نصاب میں شامل تھی، چنانچہ عہد شاہجہانی میں ملا محمود جونپوری "شمس بازغہ" میں اس کا ذکر اس فن کی اہم اور مسلم الثبوت کتاب کی حیثیت سے کرتے ہیں[1]، خود جے سنگھ کے آقائے ولی نعمت محمد شاہ (۱۷۲۴ - ۱۷۴۸ء) کے درباری طبیب معتمد الملوک علوی خاں (میر محمد ہاشم) نے اسکی اہمیت اور مقبولیت فی الدرس کے پیش نظر اس کی ایک مبسوط شرح لکھی تھی، جس کا ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں ہنوز موجود ہے، (فہرست کتب قدیم عربی فن ہیئت نمبر ۶۲) دوسری شرح (فارسی زبان میں) رصد گاہ محمد شاہی میں سوائی راجہ جے سنگھ کے معاون خصوصی مرزا خیر اللہ مہندس نے "تقریب التحریر" کے عنوان سے لکھی تھی، اس کا مخطوطہ بھی رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے، (فہرست کتب قدیم فارسی فن ہیئت نمبر ۱۱۷۵) مرزا خیر اللہ کو تو اس کتاب (المجسطی سے) اتنی عقیدت تھی کہ انھوں نے اسے اپنے ہاتھ سے نقل کیا تھا، مرزا خیر اللہ کا یہ خود نوشتہ نسخہ بھی رامپور لائبریری میں ہنوز موجود ہے، (فہرست عربی قدیم فن ہیئت نمبر)

لہٰذا اس کتاب کی اہمیت، وافادیت کے پیش نظر راجہ جے سنگھ کے ایما سے جگناتھ پنڈت نے اس کا عربی سے سنسکرت میں ترجمہ کیا، اور اس بات کو غیر مبہم الفاظ میں دیباچہ کے اندر لکھ دیا، چنانچہ جی۔ آر۔ کے نے جگناتھ پنڈت کے ترجمہ کی اصل سنسکرت

[1] ملا محمود جونپوری: الشمس البازغہ صفحہ ۳۳،

عبارت نقل کرنے کے بعد اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی دیا ہے، اُس کا کہنا ہے،

"اس کتاب کا جگناتھ پنڈت نے جو جے سنگھ کے معاونین میں سے تھا (عربی سے سنسکرت میں) ترجمہ کیا تھا جو اپنے اصل کی غیر مبہم الفاظ میں صراحت کرتا ہے . . . .

اس کے بعد (اُن اشعار کے اندر جنھیں پورے طور پر اوپر نقل کیا گیا ہے) ہمیں بتایا جاتا ہے کہ جگناتھ نے اس نفیس سمراٹ سدھانت کو جے سنگھ کی خوشنودی مزاج کے لئے مرتب کیا تھا، اور یہ کہ یہ کتاب ماہرین ریاضیات کے استفادے کے لئے ایک کتاب کا جو عربی زبان میں المجسطی کہلاتی ہے، سنسکرت ترجمہ ہے"[1]

اسی مصنف (گیرٹ) نے اسطرلاب کا شرف ایجاد بھی جسے "ینتر راجہ" کا غیر مانوس نام دیکر سنسکرت الاصل بنا دیا گیا تھا، قدیم ہندو مصنفین کو بخشا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے،

"اسطرلاب کے واسطے ہندو نام ینتر راجہ ہے، اور گیرٹ کہتا ہے کہ یہ ہندو اصل سے ماخوذ ایک بہت ہی قدیم آلہ (رصدی) ہے"[2]

مگر یہ ان ماہرین ہندوستانیات کی خوش فہمی ہے، چنانچہ کے اس غلط فہمی کی تردید کے ضمن میں لکھتا ہے۔

"واقعہ یہ ہے کہ اسطرلاب یا ینتر راج قطعاً کسی ہندو اصل سے ماخوذ نہیں ہے"[3]

اس کے بعد وہ اپنے اس دعوے کی تائید میں تاریخی شہادت پیش کرتا ہے۔

اس آلہ (کی ساخت اور طریق استعمال کے موضوع) پر قدیم ترین ہندو تصنیف

[1] کے: صفحہ ۲-۳ [2] کے: صفحہ ۳ [3] Kaye. P. 3

As a matter of fact, the astrolabe or yantra raja is not of hindu origin at all"

چودھویں صدی مسیحی میں ظہور میں آئی (حالانکہ، عربی و فارسی زبانوں میں ایسی متعدد تصانیف پائی جاتی ہیں، جن کا آغاز دسویں صدی مسیحی سے ہوتا ہے، جب کہ اس فن میں قدیم ترین ہندو تصنیف مہندر سوری کی ہے، جسے اس نے فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت میں سمبت ۱۲۹۲ مطابق ۱۳۷۰ء میں لکھا تھا۔"[1]

خود مہندر سوری اپنی کتاب کے دیباچہ میں لکھتا ہے،

"بہت سے یاونوں (یونانیوں اور اُن کے خوشہ چیں مسلمان افاضل) نے اپنی زبان (یونانی، سریانی، عربی، فارسی وغیرہ) میں اپنی مخصوص فہم و دانش کے مطابق اس آلہ (کی ساخت اور طریق استعمال) پر علمی تصانیف مرتب کی ہیں۔"

اس کے بعد وہ لکھتا ہے۔

"میں نے ان تصانیف کو سمندر کی طرح پایا، اب میں اپنی کتاب میں سب کا جوہر نکال کر اسے آب حیات بنا کر پیش کر رہا ہوں۔"[2]

بہرحال اصطرلاب ایک بہت ہی قدیم آلۂ رصدیہ ہے، جس کا شرف ایجاد قدیم یونان کو پہونچتا ہے، ہندو ہیئت داں تو چودھویں صدی مسیحی سے پہلے اس سے واقف بھی نہیں تھے، مزید تفصیل حسب ذیل ہے،

اصطرلاب کی قدامت اصطرلاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یونانی الاصل ہے۔ یہ دو لفظوں .... بمعنی ستارہ اور Astraw بمعنی ترازو سے مرکب ہے، اس کے موجد کے

۱؎ کے، صفحہ ۳ ۲؎ کے صفحہ ۳

بارے میں ابن الندیم دو رائیں دیتا ہے، ایک یہ کہ یہ مشہور یونانی ہیئت داں بطلیموس (زمانہ دوسری صدی مسیحی) کی ایجاد ہے، اور دوسری رائے جسے وہ بصیغۂ تمریض لکھتا ہے، یہ ہے کہ یہ بطلیموس کے پیشرووں کی ایجاد ہے۔[1] عہد حاضر کے محققین کا میلان اسی دوسری رائے کی طرف ہے، چنانچہ جوزف نیڈھم کہتا ہے، کہ نیوگیبر ڈرکمین کے خیال میں اصطرلاب بطلیموس سے پہلے یا علی الاقل اس کے زمانہ میں ایجاد ہوا تھا،[2] حسب تصریح ٹی۔ ایل۔ ہیتھ بطلیموس کی کتاب المجسطی کے مقالہ پنجم میں اصطرلاب کی ساخت اور طریق استعمال کا ذکر ہے۔[3] جوزف نیڈھم کہتا ہے کہ بطلیموس نے اپنی کتاب "اربعہ مقالات" میں اصطلاحی اصطرلاب کا ذکر کیا ہے۔ پانچویں صدی مسیحی کے مدرسے پر اومونیوس بازنطینی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اصطرلاب کو استعمال کیا تھا، اس کے شاگرد یوحنا فیلو پونس (یوحنا محب الاجتہاد) نے ۵۲۵ء کے قریب اصطرلاب کے موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی، اگلی صدی میں شامی بشپ سویرس میں سیبوخت نے اور نویں صدی مسیحی میں ماشاءاللہ یہودی نے اس موضوع پر کتابیں لکھیں۔[4] ابن الندیم نے ماشاءاللہ کی تصانیف میں اس موضوع پر دو کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ کتاب صنعۃ الاسطرلابات والعمل بھا، اور

۱؎ ابن الندیم ـ کتاب الفہرست صفحہ ۳۹۷

۲؎ Needham, Joseph: Science and civilization in China: vol. 3 P. 376 foot note 'a'

۳؎ Heath, T.L: Greek mathematics vol. II P 276

۴؎ جوزف نیڈھم: "سائنس اور ثقافت چین میں" جلد سوم صفحہ ۳۷۶

۲ - کتاب ذات الحلق[1]

ماشاء اللہ دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور (۷۵۴ - ۷۷۵، مسیحی) کا درباری منجم تھا، منصور کا ایک دوسرا درباری منجم ابراہیم بن حبیب الفزاری تھا جس نے اسطرلاب کے موضوع پر عربی زبان میں سب سے پہلی کتاب لکھی اور بعد کے لوگوں نے اس باب میں اسی کا تتبع کیا، چنانچہ ابن القفطی اس کے تذکرے میں لکھتا ہے۔

وهو اول من عمل فی الاسلام	وہ پہلا شخص ہے، جس نے عہد اسلام
اسطرلابا وله کتاب فی تسطیح	میں اسطرلاب کو بنایا، اسکی تصانیف
الکرة منه اخذ کل	میں ایک کتاب بعنوان "کتاب
الاسلامیین[2]	تسطیح الکرہ" ہے، اسی سے اس فن
	کو سب مسلمانوں نے سیکھا،

اس کے بعد مسلمانوں میں اصطرلاب سازی کا کام ترقی کرنے لگا، یہاں تک کہ تیسری صدی ہجری (نویں صدی مسیحی) کے آغاز میں خلیفہ مامون رشید نے بغداد اور دمشق میں رصدگاہیں تعمیر کرائیں، آلات رصدیہ کی تیاری میں اس زمانہ میں سب سے چابک دست کاریگر ابن خلف المروزی تھا، جس نے مامون کے لئے ذات الحلق بنایا تھا،[3] ابن الندیم کہتا ہے کہ مروزی نے اسطرلاب بھی بنایا تھا۔

وقد عمل المروزی	(ابن خلف) مروزی نے اسطرلاب
الاسطرلاب[4]	بھی بنایا تھا،

[1] ابن الندیم، کتاب الفہرست ص ۳۰۲ [2] ابن القفطی، تاریخ الحکما، ص ۵۷ [3] کتاب الفہرست ص ۳۹۶ [4] الفہرست ص ۳۹۵، اسطرلاب کے موضوع پر دوسری اہم تصنیف کتاب العمل بالاسطرلاب مشہور مسلمان ماہر فلکیات عبدالرحمٰن الصوفی (زمانہ دسویں صدی مسیحی کا وسط) کی ہے جسے اس نے بڑی شرح وبسط کے ساتھ لکھا ہے اس میں ۳۸۶ باب ہیں، خوش قسمتی سے دائرۃ المعارف حیدرآباد نے اسے شائع کر دیا ہے۔

ابن خلف المروزی کا شاگرد رشید علی بن عیسی الاسطرلابی تھا جس نے رصدگاہ مامونی میں بالخصوص محیط ارضی کی پیمائش میں حصہ لیا تھا،[1] آلات رصدیہ کی تاریخ میں علی بن عیسی کی شخصیت بہت زیادہ اہم ہے، اس کی خوش نصیبی ہے کہ اسطرلاب کے موضوع پر اس کا تصنیف کردہ رسالہ حوادث کے جھکڑ سہ کر باقی رہ گیا، اور اس سے زیادہ خوش نصیبی یہ کہ شائع ہوگیا۔ یعنی عربی زبان میں اسطرلاب پر جو رسالہ ۸۳۵ء (مہندر سوری کے رسالہ سے کوئی ساڑھے پانچ سو سال قبل) تصنیف ہوا تھا، وہ عوامی دسترس میں آیا اسکے بعد اس موضوع پر جو کتب و رسائل تصنیف ہوئے ان کی صحیح تعداد اللہ تعالی ہی کے علم میں ہے، اسطرلاب کا استعمال عام تھا اور یہ اہل علم و دانش کی ایک ہمہ وقتی ناگزیر ضرورت بن گیا تھا عوفی نے "جوامع الحکایات" میں لکھا ہے کہ مامون کے وزیر فضل بن سہل کا سامان سفر انتہائی ہلکا پھلکا ہونے کے باوجود ایک عدد اسطرلاب پر ضرور مشتمل ہوتا تھا، اہل علم ہی نہیں اہل حرفہ تک میں اس کا رواج عام تھا، الف لیلہ میں ایک نائی کا قصہ لکھا ہے کہ اس کی کسبت میں دوسری چیزوں کے ساتھ اسطرلاب بھی ہوا کرتا تھا، جس کی مدد سے وہ حجامت وغیرہ سے پہلے طالع دریافت کیا کرتا تھا،

بہرحال قدیم ترین اسطرلاب جس پر اس کی تاریخ ثبت ہے، احمد و احمد پسران ابراہیم اصفہانی کا بنایا ہوا تھا، جسے انھوں نے سنہ ۳۷۴ھ مطابق سنہ ۹۸۴ء میں مکمل کیا تھا،[2] یعنی مہندر سوری کے رسالہ "یتز راجہ" کی تصنیف سے تقریباً چار سو سال پہلے، بلکہ ان لوگوں کے یہاں اسطرلابوں کی کثرت تعداد کے ساتھ ان کی ساخت میں بھی تنوع بڑھتا گیا، ابوالعباس

[1] ابوریحان البیرونی، کتاب التفہیم (فارسی) مرتبہ جلال ہمائی ص ۱۹۱
[2] جوزف نیڈھم "سائنس اور ثقافت چین میں" جلد سوم ص ۳۷۶

خرغانی نے کتاب الکامل میں لکھا ہے، ابو یوسف یعقوب ابن اسحاق الکندی نے (زمانہ نویں صدی مسیحی کی ابتدا یعنی ہندر سوری سے ساڑھے پانچ سو سال پہلے) ایسا اسطرلاب بنایا تھا، جس کے اندر مقنطرات اور منطقۃ البروج مدور ہونے کے بجائے خربوزہ کی پھانکوں کی طرح بیضی ہوتے تھے، اور اسی لئے اسے "اسطرلاب مبطخ" کہتے تھے[1]، دسویں صدی مسیحی کے وسط میں احمد بن عبد الجلیل السجزی نے ایک نیا اسطرلاب اختراع کیا، جو اس اصول پر بنایا گیا تھا کہ آسمان کے بجائے زمین حرکت کرتی ہے، اُس نے اس کا نام "اسطرلاب زورقی" رکھا تھا[2]، اس کے علاوہ وہ اسطرلابوں کی دو اور قسموں کا بھی موجد ہوا اسطرلاب صلیبی" اور "اسطرلاب لولبی"۔ اُس کے معاصر عبد اللہ المعروف بہ نیک مرد قائنی نے "اسطرلاب رصدی" بنایا تھا، البیرونی کے اُستاد ابو نصر بن عراق نے اسطرلاب سرطانی مجنح" کی تیاری اور استعمال پر ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا تھا[3]، قصہ مختصر یہ کہ ابو ریحان البیرونی کے زمانہ تک مسلمان فضلا کے ایجاد و اختراع سے اسطرلاب کی ساخت میں غیر معمولی تنوع پیدا ہو چکا تھا، مذکور الصدر اقسام کے علاوہ آسی، مطبل، مسرطن، وغیرہ اور ابو ریحان البیرونی نے ان مختلف اقسام کی تیاری اور طریق استعمال پر ۳۹۰ھ کے قریب ایک مبسوط کتاب بعنوان "استیعاب الوجوہ الممکنۃ فی صنعۃ الاسطرلاب" تصنیف کی تھی۔

البیرونی کے بعد بھی اسطرلابوں کی ساخت میں تنوع ہوتا رہا، ان میں سفرجلی، الیلجی، مسطری، کری ذات العنکبوت، طوماری، ہلالی، قوسی، صدفی، جامعہ، مغنی ذات الحلق عصای موسی، عقربی زیادہ مشہور رہیں[4]۔

---

[1] بحوالہ کتاب التفہیم (فارسی)، مرتبہ جلال ہمائی ص ۲۹۰ حاشیہ، [2] استیعاب الوجوہ الممکنۃ مخطوطہ مولانا عبد الحی کلیکشن مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی، عربی نمبر ۴۹/۶۲، [3] کتاب التفہیم (فارسی) صفحہ ۲۹۰ حاشیہ، [4] ایضاً ص ۲۹۰ حاشیہ

اسطرلاب پر سب سے زیادہ مقبول کتاب خواجہ نصیر الدین طوسی کی "بست باب" ہے، جو اس صدی کے نصف اول تک عربی مدارس کے اندر ریاضی و ہیئت کے اعلیٰ نصاب میں پڑھائی جاتی تھی، نصیر الدین طوسی نے ۱۲۷۴ء میں وفات پائی تھی، یعنی انھوں نے رسالہ بست باب "ہندر سوری" سے ایک سو سال سے زیادہ عرصہ پہلے تصنیف کیا تھا،

اسطرلاب پر پہلی ہند و تصنیف:۔ غالباً اسلامی ہند اسطرلاب سے بہت قدیم زمانہ سے واقف تھا، علم ہیئت و نجوم کے باقاعدہ تعلیم و تعلم کا قدیم ترین حوالہ غزنوی عہد کے مشہور شاعر مسعود سعد سلمان (زمانہ پانچویں صدی ہجری یا گیارہویں صدی مسیحی کا وسط) کے درمیان ملتا ہے، وہ جب عتاب شاہی میں ماخوذ ہو کر قلعہ سو میں قید کیا گیا تو وہاں اُس نے ایک بوڑھے شخص بہرامی سے یہ علم حاصل کیا، چنانچہ علی خاص کی مدح میں اُس نے جو قصیدہ لکھا ہے، اُس میں کہتا ہے[1]۔

اگر نبودے بیچارہ پیر بہرامی	چگونہ بودے حال من اندرین زندان
گہے صفت کنندم حالہائے گردش چرخ	گہے بیاں دہدم رازہائے چرخ کیاں
مرا ز صحبت او شد درست علم نجوم	حساب شد ہمہ ہیئت زمین و مکاں
جناں شدم کہ بگویم نہ بر گماں بیقین	کہ چند باشد یک لحظ چرخ را دوراں

بعد میں بھی ہیئت و نجوم کا رواج رہا، بلبن کے زمانہ میں مولانا حمید الدین مطرز وغیرہ اس فن کے ماہر تھے[2]، آخری سلوک، تاجدار کیقباد کے عہد میں حسب تصریح ضیاء الدین برنی کوتوال شہر دہلی دیگر فضلاء کے ساتھ منجمین کی بھی تربیت کرتا تھا[3]۔ علاء الدین خلجی کے

---

[1] کلیات مسعود سعد سلمان مرتبہ رشید یاسمی ص ۴۷۴ [2] ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی ص ۱۱۲ [3] تاریخ فیروز شاہی ص ۱۲۹۔

زمانہ میں شہر دہلی میں نجومیوں کی کثرت انتہا کو پہونچ گئی تھی،[1] جن میں اکثر رصد بندی کے کام کی بھی صلاحیت رکھتے تھے،[2] محمد تغلق بقول فرشتہ دوسرے علوم میں تبحر کے ساتھ نجوم میں بھی دستگاہ عالی رکھتا تھا،[3]

محمد تغلق کا جانشین فیروز تغلق، نجوم کے ساتھ اسطرلاب سازی میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا، چنانچہ "سیرت فیروز شاہی" کا مصنف لکھتا ہے۔

"و علم نجوم و دقایق آں بشابہ در ضبط آمدہ کہ چندیں مصنفات و مولفات و قواعد آں بتالیف و تصنیف خاص مخصوص گشتہ و باملا و ارشاد حضرت مسطور و مذکور است. و اسطرلابہا با قواعد و قوانین این علم ساختہ و رسالہا در وضع آں پرداختہ

اے منور بتو نجوم جلال — و مقرر بتو رسوم کمال"۔

آگے چل کر یہی مصنف فیروز تغلق کے بنائے ہوئے کئی اسطرلابوں کی تفصیل بیان کرتا ہے۔

"و اسطرلابات تصنیف خاص اسطرلابے از نقرہ بغرض ہفت اقلیم چہ اسطرلابات دیگر بشہرے می کنند کہ دراں کار آید و ایں بہفت اقلیم کار آید،

و اسطرلابے دیگر از نقرہ شمالی و جنوبی، دراں منطقہ کشیدہ اند و منطقہ و عنکبوت آں شمالی و جنوبی کواکب ثبت کردہ، و اسطرلابے دیگر برنجی شمالی و جنوبی بغرض ہفت اقلیم،

---

[1] تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۶۳ [2] ۳۶۲-۳۶۳ [3] ایضاً ص ۳۶۳ [4] "منجمان عصر علائی کہ ہم در استخراج احکام نجوم و ہم در رصد بندی ماہر و کامل بودند" [5] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۳۳، "(محمد تغلق) بجمیع علوم معقول خصوص طب و حکمت و نجوم و ریاضی و منطق مہارتے تمام داشت"۔

و اسطرلابے دیگر از نقرہ شمالی، دراں حدود بروج و وجوہ و ارباب مثلثات در آں و ساعات و شرف کواکب و ہبوط ایشاں مسطور،

دیگر میزان فیروز شاہی ایک طبقی در اسطرلابات دیگر بعض بسیار، طالع و ساعت و آنچہ بدو منسوب است پیدا تواں کرد، اما ہمیں بمجرد ارتفاع گرفتن ساعات و طالع حاصل می شود"۔

صاحب سیرت فیروز شاہی نے لکھا ہے کہ فیروز تغلق کو بتایا گیا کہ سکندر کے زمانہ میں شہر اسکندریہ میں اسطرلاب بنایا گیا تھا، مگر وہ شمالی تھا، جنوبی نہ تھا، اس کی "کمری" ایک عرصہ تک تو بحال خود برقرار رہی، بعد میں مختل ہوگئی، بہرحال بادشاہ فیروز تغلق نے بھی اپنی فہم و ذکاء کی مدد سے ایک اسطرلاب جو شمالی و جنوبی دونوں پر مشتمل تھا تیار کیا، مملکت کے ماہرین حکمت و نجوم اور محاسبین و مہندسین کو جمع کیا اور فرمایا۔

حکیماں کہ من دارم از بیش کم — بحکمت در آفاق گشتہ علم
مرا نیز دانند از خاص عام — کہ دارم دراین علم دستے تمام
چرا باید آخر کہ در روزگار — نشانے نماند زمن روزگار

اس اسطرلاب تام کو اس نے اسطرلاب فیروز شاہی کا نام دیکر شہر فیروز آباد کے سب سے اونچے منارہ پر نصب کیا، صاحب سیرت فیروز شاہی نے لکھا ہے۔

"اسطرلابات نامہ کہ آں منسوب است باسطرلاب فیروز شاہی و بر بالاترین منارۂ فیروز آباد نصب کردہ اند باختراع و تصنیف و ارشاد و تالیف خاص حضرت سلطنت خلد اللہ ملکہ مرتب شدہ"۔

آگے چل کر وہ ان آلات کے اختراع کے بارے میں لکھتا ہے،

"الحق تصنیف آں آلات جدید محقق بارشاد و تالیف رائے ہمایونست کہ در وضع
آں ہیچ حکیمے و صاحب صنعتے را دخل وہ دے نبودہ، آں اسطرلاب نام بسبی جمیں پادشاہ
اسلام شمالی و جنوبی مرتب شدہ سے

چو ہر کس مثالے ز ہر باب ساخت — خداوند عالم سطرلاب ساخت .....

مصنف سیرت فیروز شاہی نے اسطرلاب سازی میں بادشاہ کے اتقان و چابکدستی کی
بڑی مبسوط تفصیل دی ہے، جس کا استقصا موجب تطویل ہوگا۔

ظاہر ہے حکمران وقت کے اس شوق فراواں و انداز طبیعت سے رعایا اثر لئے بغیر نہیں
رہ سکتی تھی کہ

الناس علی دین ملوکہم

اور مسلمان رعایا کے ساتھ ہندو رعایا بھی اس سے متاثر ہوئی۔ آگے ہنڈیل اور پ الکر
کی شہادت آرہی ہے کہ بارھویں صدی مسیحی کے بعد سے ہند نجوم و ہیئت پر عربی و فارسی زبانوں
میں ان موضوعات پر لکھی ہوئی کتابوں کے اثرات پڑنے لگے تھے،

وقت کی اس عام روش سے ہند دسوری نے بھی تاثر قبول کیا، اور عربی و فارسی زبانوں
میں "یادنوں" (مسلمانوں) کی متعدد تصانیف سے استفادہ کرنے کے بعد "ہنتر راجہ" کے
عنوان سے اسطرلاب پر ایک کتاب لکھی جیسا کہ وہ خود معترف ہے۔

"بہت سے یادنوں (مسلمانوں) نے اپنی زبان میں اپنی فہم و دانش کے مطابق
اس آلہ کے موضوع پر علمی تصانیف مرتب کی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے ان تصانیف
کو سمندر کی طرح پایا، اب میں اپنی کتاب میں ان سب کا جوہر نکال کر بطور آبحیات
پیش کر رہا ہوں"[لہ]

لہ کے: جے سنگھ کی رصد گاہیں۔ ص ۳

اس تفصیل کے بعد مسٹر کیرے اور ان کے انداز پر سوچنے والے مقامی اور بیرونی فضلا کا
یہ دعویٰ کہ اسطرلاب ہندو اصل سے ماخوذ ہے، اور قدیم ہندو علم الہیئت میں استعمال ہونے والا آلہ
رہا ہے، کسی مزید تنقید کا محتاج نہیں رہتا۔

مگر ان سب سے زیادہ دلچسپ "چھیتر درس" کا قصہ ہے، جسے مسٹر ولیم جونس جیسے ہندسی
عبقریت کا شاہکار رہتا ہے، جیسا کہ جی۔ آر کے نے اس سے نقل کیا ہے،

" وہ سنسکرت تصنیف جس سے ہم مکمل ترین اور اہم ترین معلومات کی
اُمید کر سکتے ہیں "چھیتر درس" یا علم الہندسہ کا منظر ہے، اس کتاب کو ایک ضخیم
جلد میں مشہور راجہ جے سنگھ کے حکم سے مدون کیا گیا تھا، اس کے اندر وہ سب
کچھ موجود ہے، جو اس علم کے اندر ہندوستان کی مقدس زبان (سنسکرت) میں
باقی رہ گیا تھا"[لہ]

اس "شاندار دریافت" کا احیائیت نواز حلقوں میں جس گرم جوشی سے خیر مقدم
کیا گیا ہوگا، اس کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت بمبئی سے
اس کتاب کو زیور طبع سے آراستہ کرنے کی بڑی شد و مد سے تحریک کی گئی، اور رقم
کثیر اور اس سے زیادہ محنت شاقہ برداشت کرنے کے بعد یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ
ہو کر منظر عام پر آئی۔ مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

بعد میں یہ پتہ چلا کہ یہ خواجہ نصیر الدین طوسی کی، تحریر اصول اقلیدس کا سنسکرت ترجمہ[ٹ]

لہ کے، صفحہ ۶۹، ٹ Kaye. G.R., P.69 "At considerable Tr9uble and exeense This work was published by Bombay Government and it turned out to be a Sanskrit translation of Nasir al-Din al-Tusis edition of Euclids> Elements.

تحریر اُصول اُقلیدس اُس زمانہ کے عربی مدارس کے اندر، ریاضی کے اعلیٰ نصاب میں شامل تھی، چنانچہ خود بادشاہ محمد شاہ کے طبیب خصوصی معتمد الملک علوی خاں (میر محمد ہاشم جن کی "شرح تحریر المجسطی" کا اوپر ذکر آچکا ہے) نے بھی اس کتاب و تحریر اُصول اقلیدس کی ایک مبسوط شرح لکھی تھی، جس کا ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے، (فہرست کتب عربی۔ قدیم۔ فن ریاضی نمبر ۱۴، ۲۲، ۳۳، ۴۴ صفحہ ۲۱۵)

جہاں "تحقیق انیق" کا معیار اس درجہ بلند ہو، ظاہر ہے وہاں احقاق حق کے امکانات کتنے روشن ہو سکتے ہیں۔

ہندو ہیئتی ورثہ کی نوعیت

اسی احیائیت پسندانہ جذباتیت اور استعمار پسندانہ سیاسی مصلحت کا نتیجہ ہے کہ جوتش کی عظمت و قدامت کے بارے میں انتہائی مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا، ہندو روایات کے مطابق "سوریہ سدھانت" لاکھوں سال پہلے تصنیف ہوا تھا، یہ تو مقامی فضلاء کا خیال ہے، مستشرقین بھی اس معاملہ میں کچھ پیچھے نہیں رہے بیلی کا اٹھارویں صدی کے خاتمہ پر خیال تھا کہ ہندو علم الہیئت کی اساس اُن صحیح مشاہدات پر رکھی گئی تھی، جو سنہ مسیح سے ہزاروں سال پہلے کئے گئے تھے، لاپلاس جس نے بیلی کے فراہم کردہ اعداد پر اعتماد کر لیا تھا، اس کا خیال تھا کہ قدیم ہندوستان میں سنہ ۳۱۰۲ ق.م میں مختلف اجرام فلکی کے مشاہدات کئے گئے تھے، جو ایک ثانیہ تک صحیح تھے، پلے فیر بھی بیلی کی رائے کا موید ہے، سر ولیم جون نے بدلائل دعویٰ کیا ہے کہ جوتش کے صحیح مشاہدات سنہ ۱۱۰۱ ق.م میں کئے گئے تھے[1]

لیکن کچھ اور محققین بھی ہیں، جنھیں اس اغراق و غلو سے اتفاق نہیں ہے، چنانچہ

---

[1] کے: صفحہ ۱۰

پنٹلی، کولبروک، ڈیمبر وہٹنی، تھیبوٹ وغیرہ نے زیادہ صحیح رائیں پیش کیں جن سے معلوم ہوا کہ بیلی نے جو اعداد استعمال کئے ہیں، وہ نسبتاً حال کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں[1] رہی جوتش کی عظمت تو ایسے مقامی اور بیرونی علماء کی کمی نہیں ہے، جو اس کی افادیت سے قطعاً مایوس ہیں، چنانچہ "Every Mans Encyclopedia" کا ایک آرٹیکل نویس لکھتا ہے۔

"نہ تو ہندوؤں نے اور نہ ہی مصریوں نے علم الہیئت میں کسی نمایاں اہمیت کا اضافہ کیا"[2]

یہ یورپین فضلاء ہی کا خیال نہیں ہے ہندو فضلاء کو بھی اس کا اعتراف ہے، چنانچہ پروفیسر A. W. Lunea جو ہلکر کالج اندور میں شعبۂ تاریخ کے صدر رہے ہیں لکھتے ہیں

"ہندو، علم الہیئت پر یونانی اثرات کا پتہ (قدیم) ہندوستانی ماہرین فن کی کتابوں میں لگایا جا سکتا ہے، یہ لوگ یونانیوں اور یونانی اساتذہ کا کے اقوال کا بڑے احترام سے ذکر کرتے ہیں، اہل ہند نے ہیئت کا علم یونانیوں سے حاصل کیا، اور اس بات کا بڑی فراخدلی سے اعتراف کیا جاتا ہے، یونانی غیر متمدن تھے، بایں ہمہ ہیئت کے علم کا آغاز انھیں سے ہوا، اور اس لحاظ سے ان کا دیوتاؤں (کا) دوتاؤں کی طرح احترام کیا جانا چاہیئے"[3]

پھر ہندو علم الہیئت کا ماضی (ماضی بعید) کتنا ہی درخشان و تابناک نہ رہا ہو مگر بارہویں صدی مسیحی کے بعد سے یہ ایک بھولی بسری داستان بن گیا، یہ کے (G. R. Kaye)

---

[1] کے: صفحہ ۱۱۲ Vol. I P. 479 "Astronomy"

[3] "Evolution of Indian culture P. 296

یا کسی یورپین مستشرق کا خیال نہیں ہے، بلکہ محب وطن اور احیائیت نواز ہندو فاضل عہد کی رائے ہے، جو ہند و علوم و فنون کے ارتقا کے ماہر خصوصی سمجھے جاتے ہیں، چنانچہ ایم۔ اے۔ ایچ۔ اے میہنڈیل (M. A. Mehendale) اے۔ ڈی پسالکر (A. D. Pusalkar) نے بھارتیہ ودیا بھون کی شائع کردہ "History and Culture of Indian People" کی مختلف جلدوں میں ہندوؤں کے علمی کمالات پر ابواب لکھے ہیں، اس کتاب کی پانچویں جلد میں لکھتے ہیں۔

"ریاضیات کی طرح علم الہیئت میں بھی بھاسکر آچاریہ کے بعد کسی فاضل نے ان علوم کی ثروت میں کوئی قابل لحاظ اضافہ نہیں کیا۔"[1]

یہی فضلاء اس کتاب کی چھٹی جلد میں لکھتے ہیں۔

"عظیم بھاسکر آچاریہ کے بعد کوئی ایسا فاضل دکھائی نہیں پڑتا جس نے واقعی طور پر علم الہیئت میں دلچسپی لی ہو۔"[2]

علمی ہیئت (Scientific Astronomy) کے بجائے پنڈتوں کی دلچسپی نجوم اور جوتش میں بڑھنے لگی، چنانچہ یہی فضلاء بھاسکر آچاریہ کے پوتے جگدیو کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس نے اپنے دادا کی تصانیف کے تعلیم و تعلم کے لئے ۱۲۵۰ء میں ایک پاٹھ شالہ قائم کی تھی، مگر اس کے ارکان کی بیشتر توجہ نجوم اور جوتش پر مرکوز رہی،[3]

بعد ازاں متاخر تاجیکاؤں پر مسلمانوں کی ہیئتی تصانیف کا (جو عربی و فارسی میں

---

[1] "اہل ہند کی تاریخ اور ثقافت" جلد پنجم ص ۳۲۹ [2] ایضاً جلد ششم ص ۴۰۹

[3] ایضاً جلد ششم ص ۴۰۹۔ اسی زمانہ میں امیر فتح اللہ شیرازی اور ابوالفضل کی مدد سے کشن جوتشی گنگادھر نیش اور رما نند نے زیج الغ بیگ کا فارسی سے ہندی (و سنسکرت) میں ترجمہ کیا (آئین اکبری جلد اول ص ۸۲)

لکھی گئی تھیں) اثر پڑنے لگا۔ جب کہ یہی فاضل علماء لکھتے ہیں۔[1]

"Under the Arabic and persian influence however were undertaken the later tajikas like the one by Nilkantha (A.D. 1587) in Two parts."

[عربی و فارسی (ہیئتی تصانیف) کے زیر اثر متاخر تاجیکائیں ظہور میں آئیں جیسا کہ نیلکنٹھ (زمانہ ۱۵۸۷ء) کی تاجیکا جسے اس نے دو حصوں میں لکھا تھا۔]

اسی اثر سے متاثر ہو کر مہندر سوری نے اسطرلاب سازی پر اپنا مشہور رسالہ لکھا جو سنسکرت ادب میں اپنے موضوع کی پہلی پیش کش ہے (تفصیل اوپر مذکور ہو چکی ہے)

قدیم روایتی ہندو علم الہیئت سے راجہ جے سنگھ کی اثر پذیری کا مسئلہ

معلوم نہیں جی۔ آر۔ کے نے "زیج محمد شاہی" کا ہندو جوتش کی قدیم تصانیف اور مسلم علم الہیئت کے شاہکاروں کے ساتھ تقابلی مطالعہ کیا تھا، یا نہیں۔ ویسے ظاہری قرائن سے تو اس کا جواب نفی ہی میں معلوم ہوتا ہے، ممکن ہے، وہ سنسکرت سے واقف ہو، لیکن غالباً وہ عربی فارسی سے آشنا نہیں تھا، اور شاید "زیج محمد شاہی" کے دیباچہ (جس کا انگریزی ترجمہ اس کے سامنے موجود تھا) سے زیادہ وہ اس کے محتویات سے واقف بھی نہیں تھا۔

بایں ہمہ جے سنگھ کے ہندو اور مسلم ماخذوں کے بارے میں اس نے جو رائے دی ہے،

---

[1] اہل ہند کی تاریخ اور ثقافت" جلد ششم صفحہ ۴۰۹۔ اس زمانہ میں امیر فتح اللہ شیرازی اور ابوالفضل کی مدد سے کشن جوتشی گنگادھر، نیش اور رما نند نے "زیج الغ بیگ" کا فارسی سے ہندی (و سنسکرت) میں ترجمہ کیا، (آئین اکبری جلد اول صفحہ ۸۲)

وہ بڑی حد تک اقرب الی الصحت ہے، بالخصوص ہندو مآخذ کے بارے میں، چنانچہ وہ قدیم روایتی ہندو علم الہیئت سے جے سنگھ کے اخذ و استفادے کے بارے میں کہتا ہے۔

" یہ مفروضہ کہ اُس نے (راجہ جے سنگھ نے) اپنے مخصوص ہیئتی تصورات ہندو روایات سے اخذ کئے تھے قطعی طور پر ساقط الاعتبار ہوچکا ہے"[1]

غالباً یہ مفروضہ ابتداءً اُن لوگوں نے قائم کیا تھا، جنھوں نے "سمراٹھ جنتر" کو راجہ جے سنگھ کی تصنیف اور اُس کے محتویات کو اُس کے مخصوص ہیئتی تصورات سمجھ لیا تھا، اس لئے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ راجہ جے سنگھ نے اپنی ہیئتی معلومات قدیم سنسکرت ماخذوں سے اخذ کی ہیں۔

لیکن اب جب کہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ "سمراٹھ جنتر" المجسطی کا سنسکرت ترجمہ ہے، تو اس قسم کی خوش فہمیوں کا کوئی محل نہیں رہا۔

راجہ جے سنگھ کی تحصیل علم کے سلسلے میں یہ تفصیل نہیں ملتی کہ اُس نے قدیم ہندو جوتش ودیا کی کون کون سی کتابیں مطالعہ کی تھیں، بعض لوگوں نے یہ قیاس آرائی کی ہے، کہ اُس نے "سوریہ سدھانت" کا بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا تھا، اور جب اسکے محتویات اُس کی تحقیق پسند طبیعت کو مطمئن نہ کرسکے، تو پھر اُس نے مُسلم علم الہیئت کی طرف توجہ مبذول کی۔[2]

لیکن اول تو، جیسا کہ ان لوگوں کا خیال ہے، وہ "سوریہ سدھانت" سے مطمئن نہیں ہو سکا۔ اس لئے اس سے اخذ و استفادہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

---

[1] کے، صفحہ ۸۰ (اُس کے اصل الفاظ اوپر نقل ہو چکے ہیں)، [2] جی۔ ایم موریس: "دربار جے پور میں پہونچنے والے ہیئتی وفود" (جرنل آف بمبئی برانچ آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی جلد ۲۶، ۱۹۵۱ء) صفحہ ۶۳

دوم یہ کہ "سوریہ سدھانت" اور "زیج محمد شاہی" کے محتویات میں کوئی مماثلت ہی نہیں ہے، جو ثانی الذکر کے اول الذکر سے اثر پذیری کا سوال پیدا ہو۔

البتہ کے (G.R Kaye) نے راجہ جے سنگھ کے مسلم ماخذ کے بارے میں جو رائے دی ہے اس میں ترمیم کی کافی گنجایش ہے، کیونکہ مسلمان ہیئت دانوں کی مرتب کردہ زیجوں، بالخصوص "زیج الغ بیگ" اور "زیج محمد شاہی" کے درمیان غیر معمولی مماثلت ہے، اور اس لئے بات محض اتنی ہی نہیں ہے کہ

"ان عوامل و موثرات کے باب میں ذرا سا بھی شک نہیں ہے، جنھوں نے جے سنگھ کی ہیئتی سرگرمیوں کا رخ متعین کیا یہ الغ بیگ جیسے مسلمان ہیئت دانوں کے اثرات تھے"۔

بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہے، یعنی یہ کہ اگر "زیج محمد شاہی" کو "زیج الغ بیگ" کا سرقہ کہنا سوءِ ادب ہو تو کم از کم مقدم الذکر کو مؤخر الذکر کا چربہ یا (Revised Edition) تو ضرور کہا جائے گا۔

لیکن یہ ایک علاحدہ بحث ہے اور اپنی تفصیلی وضاحت کے لیے ایک مستقل پیش کش کی متقضی ہے۔

بہر حال اتنا متحقق ہے کہ راجہ جے سنگھ کی ہیئتی سرگرمیاں (بالخصوص وہ جنھیں اُس نے "زیج محمد شاہی" میں قلمبند کیا ہے)، ہندو مآخذ و مصادر کی رہین منت نہیں تھیں، اور فاضل مصنف (جی۔ آر کے) غیر مبہم اور موکد الفاظ میں اس حقیقت کے بار بار اعتراف کو اپنی تحقیقی ذمہ داری سمجھتا ہے، چنانچہ ایک اور جگہ کہتا ہے۔

"بے شک جے سنگھ ہندو ہیئت دانوں کی تصانیف سے اچھی طرح واقف تھا، مگر

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے ان سے بہت زیادہ براہ راست استفادہ نہیں کیا۔"[1]

راجہ جے سنگھ نے نظری علم الہیئت میں کوئی اضافہ نہیں کیا، لیکن آلاتِ رصدیہ کی اصلاح واختراع میں مساعی علمیہ کا بہت بڑا مقام ہے مگر آلات رصدیہ کی اصلاح وترقی کے سلسلے میں بھی وہ اگر مرہون منت ہے تو اپنے مسلمان پیشرودں کا، چنانچہ وہ خود زیج محمد شاہی" کے دیباچہ میں اس کا معترف ہے،

"چندے از آلات رصدی مانند آنکہ در سمرقند ساختہ بودند، از روے کتب اسلامیان درین جاہم ساخت، ذات الحلق برنجی بقطر سہ گز از آنجا کہ این عصر کہ قریب ضعف وذراع اہل شرع است وذات الشقتین وذات الشعبتین وسدس فخری وشاملہ۔"

بعد میں جب اسے ان برنجی آلات کی کارکردگی میں کچھ دقتوں کا احساس ہوا تو اُس نے چونے اور پتھر کے آلات رصدیہ بنوائے، ان آلات کے اس نے ہندی نام رکھے (سمراٹھ، رام جنتر جے پرکاش) مگر یہ نام ہی کی حد تک ہندی ہیں، ورنہ ہندو جوتش سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے، اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس ملک میں کبھی کوئی رصدگاہ (اپنے واقعی مصداق کی حیثیت سے) قائم ہی نہیں ہوئی، چنانچہ ایک اطالوی مورخ علم الہیئت جیورجیو ابیٹی لکھتا ہے۔

"ہندوستان کے شہروں کے کھنڈروں میں بابل کی طرح کسی رصدگاہ کے نشان نہیں ملتے۔"

خود راجہ جے سنگھ نے "زیج محمد شاہی" کے دیباچہ میں اس کا اعتراف کیا ہے۔

"مدت مدید شدہ کہ از راجہ ہائے ذوی الاقتدار کسے پیرامون آں کار (تعمیر رصدگاہ) نگردیدہ۔"

---

[1] جی۔ آر۔ کے، صفحہ ۸۸

فاضل مصنف نے پوری تحقیقی ذمہ داری کے ساتھ اُن آلات کی تفصیل دی ہے جو قدیم ہندو جوتش کے ماہرین کے زیر استعمال رہے ہونگے، مگر جے سنگھ کے تعمیر کردہ چونے پتھر کے آلات رصدیہ کا ان سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ وہ (جی۔ آر کے) بڑے موکد الفاظ میں کہتا ہے۔

"اس (جے سنگھ) کے سنگی آلات رصدیہ اُن تصورات کے زیر اثر تیار کئے گئے تھے، جو اُس نے (سابق) مسلمان ہیئت دانوں سے اخذ کئے تھے جن آلات رصدیہ کا ذکر (قدیم) ہندو تصانیف میں کیا گیا ہے، اُن میں جے سنگھ کے مخصوص آلات رصدیہ (سمراٹھ جنتر، رام جنتر، جے پرکاش) اور قدیم ہندو جوتش کے آلات رصدیہ میں کوئی امر مشترک نہیں ہے۔"[1]

البتہ اگر اُن کا کسی سے تعلق ہے، اور راجہ جے سنگھ نے کسی قدیم آلہ رصدیہ کو نمونہ عمل بنا کر اپنے مخصوص آلات رصدیہ تعمیر کئے تو وہ مسلمان ماہرین آلات رصدیہ کے آلات تھے، چنانچہ فاضل مصنف کہتا ہے۔

"عام طور پر جے سنگھ کے آلات (رصدیہ) اُن سابق آلات (رصدیہ) کی یا تو بعینہ نقل تھے، یا براہ راست اصلاح تھے، جنھیں الغ بیگ یا اُس کے پیشرووں اور بعد میں آنے والوں نے استعمال کیا تھا۔"[2]

---

[1] کے: صفحہ ۸۹ [2] کے: صفحہ ۸۶

خطیب بغدادی

اور
ان کے بعض مخطوطات

از ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خاں شروانی ریڈر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

"یہ مضمون آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے ۲۹ ویں اجلاس منعقدہ پونا میں پڑھا گیا، اور اب کسی قدر حک و اضافے کے بعد ناظرین "معارف" کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔"

ابوبکر احمد بن علی بن ثابت بن احمد بن مہدی المعروف بہ خطیب بغدادی کی ولادت ۲۴ جمادی الاخری سنہ ۳۹۲ھ جمعرات کو[1] عراق کے ایک گاؤں درزیجان[2] میں ہوئی جہاں ان کے والد ابوالحسن علی خطیب تھے،[3] بعض مصنفین نے ان کی ولادت بجائے سنہ ۳۹۲ھ کے سنہ ۳۹۱ھ[4] بیان کی ہے، اور یوسف العش نے اپنی تصنیف "الخطیب البغدادی مورخ بغداد و محدثہا" میں لکھا ہے کہ وہ "غُزیّۃ" کے مقام پر پیدا ہوئے تھے،[5] جو حجاز میں وادی ملل میں

[1] ابن خلکان: وفیات الاعیان ۱: ۷۶-۷۷ (المطبعۃ المیمنیۃ، قاہرہ، سنہ ۱۳۱۰ھ) [2] ابن تغری بردی: النجوم الزاہرۃ، ۵: ۸۷ (برکلے سنہ ۱۹۰۹-۱۲ء) [3] ابن العماد الحنبلی۔ شذرات الذہب۔ ۳: ۳۱۱ (مکتبۃ القدسی، مصر سنہ ۱۳۵۰ھ) الذہبی۔ تذکرۃ الحفاظ ۳: ۱۱۳۵ (دائرۃ المعارف، حیدرآباد سنہ ۱۹۳۲ء) [4] ابن خلکان۔ وفیات الاعیان؛ ابن کثیر۔ البدایۃ والنہایۃ ۱۲: ۱۰۱ (مطبعۃ السعادۃ مصر سنہ ۱۳۲۶ھ)، ابن تغری بردی۔ النجوم الزاہرۃ [5] یوسف العش۔ الخطیب البغدادی (المکتبۃ العربیۃ، دمشق، سنہ ۱۳۷۰ھ)

واقع ہے، معجم البلدان کی روایت کے مطابق غُزیّۃ کا جاے وقوع فید سے ایک دن کی مسافت پر ہے،[1] زرکلی نے بھی الاعلام میں ان کی ولادت غُزیّۃ ہی کی بتائی ہے، اور لکھا ہے کہ وہ کوفہ اور مکہ کے درمیان نصف مسافت پر واقع ہے،[2] اس کے برعکس عمر رضا کحالہ نے معجم المؤلفین میں پہلے خیال کی تائید کی ہے،[3] خطیب نے عمر کا ابتدائی حصہ بغداد میں گزارا،[4] ان کے والد کو علم سے لگاؤ تھا، ان ہی کی تحریک پر خطیب کو تحصیل علم کا شوق ہوا، گیارہ برس کی عمر میں والد نے انھیں حدیث سنوانی شروع کردی تھی،[5] ابتدا میں خود ان کا رجحان فقہ کی طرف تھا، چنانچہ انھوں نے ابوالحسن المحاملی،[6] قاضی ابوالطیب الطبری،[7] ابونصر بن الصباغ[8] سے فقہ کی تعلیم حاصل کی، شیخ ابواسحاق شیرازی کے درس میں بھی شریک ہوئے، اور ان سے بہت استفادہ کیا، اپنی تصانیف میں ان کا ذکر کیا ہے،[9] بعد میں حدیث اور تاریخ کی طرف میلان بڑھ گیا تھا، شیخ ابواسحاق شیرازی کا خیال تھا کہ علم حدیث میں ان کا پایہ دارقطنی سے مشابہ تھا،[10] حصول علم کے لیے متعدد مقامات کا سفر کیا اور جہاں گئے، نامور محدثین سے حدیث کی سماعت کی، بیس[11] سال کی عمر میں بصرہ اور ۲۳ سال کی عمر میں

[1] یاقوت الحموی: معجم البلدان ۱۳: ۸۰ [2] الزرکلی: الاعلام ۱: ۱۶۶ (قاہرہ، سنہ ۱۳۴۷ھ) [3] عمر رضا کحالہ: معجم المؤلفین ۲: ۳ (المکتبۃ العربیۃ۔ دمشق سنہ ۱۳۷۶ھ) [4] ابن الجوزی۔ المنتظم فی تاریخ الملوک والامم ۸: ۲۶۵ (دائرۃ المعارف حیدرآباد سنہ ۱۳۵۹ھ) [5] ابن العماد: شذرات الذہب ۳: ۳۱۱ [6] ابن تقی الدین السبکی۔ طبقات الشافعیۃ الکبری ۳: ۱۳ (المطبعۃ الحسینیۃ، مصر) [7] السبکی ۱۔ طبقات الشافعیۃ الکبری [8] السبکی: طبقات الشافعیۃ الکبری، الجزء کذا [9] النووی۔ تہذیب الاسماء واللغات ۱: ۲ - ۲۴۷ (ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، مصر) [10] ابن خلکان: وفیات الاعیان [11] السبکی، طبقات الشافعیۃ الکبری

نیشاپور اور وہاں سے اصفہان گئے، راستے میں ہمدان اور جبال سے گزر ہوا، پھر بغداد واپس آکر[1]
شام کے لئے روانہ ہوئے، اور وہاں تھوڑی تھوڑی مدت دمشق اور صور میں قیام کرکے مکہ
چلے گئے، جہاں حج کیا، اسی سال قاضی ابو عبداللہ محمد بن سلامہ القضاعی بھی حج کے لیے
آئے ہوئے تھے، ان سے حدیث سنی اور ستی کریمہ بنت احمد المروزی کے سامنے پانچ دن
میں صحیح بخاری پڑھی، پھر بغداد واپس آئے، اور وزیر ابوالقاسم بن مسلمہ سے تقرب حاصل
کیا، ابن شافع کی روایت کے مطابق صور کے دوران قیام میں وہاں کے والی عزالدولہ
سے بھی انھیں قرب حاصل رہ چکا تھا، اور بہت مالی منفعت پہنچی تھی۔[3] بساسیری فتنے
کے موقع پر خطیب بغدادی روپوش ہوگئے، اور بغداد سے نکل کر دوبارہ شام پہنچے جہاں
دمشق میں قیام کیا، وہاں سے صور، پھر طرابلس اور پھر حلب گئے، صور کے دوران قیام
میں بار بار بیت المقدس کی زیارت کے لیے جاتے رہے، ۴۶۲ھ کے آخر میں بغداد
واپس آئے، اور ذی الحجہ ۴۶۳ھ کو پیر کے دن وہیں وفات پائی۔[4] سمعانی کی روایت
ہے کہ ان کی وفات شوال میں ہوئی،[5] دوسرے دن حضرت بشر بن حارث حافی کے پہلو میں
باب حرب میں دفن ہوئے،[6] ابن القلانسی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ان کی تدفین امام احمد بن حنبل
کے مزار کے قریب ہوئی۔[7] چونکہ ان کا وارث کوئی نہیں تھا، اس لئے انھوں نے وصیت کی کہ

---

[1] السبکی۔ طبقات الشافعیۃ الکبری۔ [2] الذہبی۔ تذکرۃ الحفاظ ۳: ۱۱۴۶

[3] ابن الجوزی۔ المنتظم فی تاریخ الملوک والامم ۸۔ ۲۶۶، یاقوت الحموی۔ ارشاد الاریب ۱: ۲۴۶
(مطبعہ ہندیہ قاہرہ ۱۹۲۵ء)۔ [4] ابن خلکان۔ وفیات الاعیان [5] السمعانی۔ کتاب الانساب
۲۰۳ (مجموعہ گب ۱۹۱۲ء) [6] ابن خلکان۔ وفیات الاعیان؛ ابن کثیر۔ البدایۃ والنہایۃ ۱۲: ۱۰۳
[7] ابو یعلی حمزہ بن القلانسی، ذیل۔ تاریخ دمشق ۱۰۴ (مطبعۃ الآباء الیسوعیین، بیروت ۱۹۰۸ء)

ان کا سب مال واسباب صدقہ کر دیا جائے، اور اپنی سب کتابیں اور تصانیف مسلمانوں
کے لیے وقف کر دیں۔[1]

خطیب بغدادی سے حدیث روایت کرنے والوں میں متعدد اہل علم شامل ہیں، [illegible]
ان کے شیوخ ابوبکر البرقانی اور ابوالقاسم الازہری کے نام بھی لیے جاتے ہیں، ان کے
معاصرین میں عبدالعزیز بن احمد الکتانی نے ان سے روایت کی ہے، اور ان کے شاگردوں
میں ابن ماکولا، عبداللہ بن احمد السمرقندی، محمد بن مرزوق الزعفرانی، اور ابو[illegible]
کے نام قابل ذکر ہیں،[2] علم کلام میں وہ ابوالحسن الاشعری کے مسلک کے پیرو تھے،[3] اور
فقہی اعتبار سے شروع میں حنبلی تھے، لیکن حنبلی علماء کا خیال تھا کہ ان کا رجحان بدعت
کی طرف ہے، اس لئے حنبلیوں سے انھیں سخت تکلیفیں پہنچیں، چنانچہ بعد میں انھوں نے
شافعی مذہب اختیار کیا، اور اپنی تصانیف میں حنبلیوں کے خلاف تعصب کا مظاہرہ کیا۔[4]

انھیں خطیب کا لقب اس لیے دیا گیا تھا کہ وہ درب ریحان میں خطبہ دیتے تھے،[5]
ان کے علمی ذوق کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے، کہ ابن کثیر کی روایت کے مطابق
راستہ چلتے ہوئے کتاب پڑھتے رہتے تھے،[6] انھوں نے خلیفہ قائم باللہ سے، جو ان کی علمیت کا
قائل تھا، درخواست کی تھی کہ انھیں جامع منصور میں روایت حدیث کی اجازت دی جائے،
چنانچہ اجازت دی گئی،[7] ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ابن عساکر کے حوالہ سے ابوالفضل بن
خیرون کی روایت نقل کی ہے، کہ خطیب نے حج کے موقع پر آب زمزم کے تین گھونٹ

---

[1] ابن خلکان۔ وفیات الاعیان، [2] السبکی۔ طبقات الشافعیۃ الکبری؛ ابن عساکر۔
تبیین کتاب المفتری ۲۶۸ - ۲۷۱ (مطبعۃ التوفیق دمشق ۱۳۴۷ھ) [3] یاقوت الحموی۔
ارشاد الاریب، [4] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ [5] ایضاً [6] یاقوت الحموی، ارشاد الاریب،

پی کر تین دعائیں کی تھیں، بغداد میں اپنی تاریخ کی روایت کریں، جامع منصور میں روایت حدیث کریں، حضرت بشر بن حارث کے پہلو میں دفن ہوں، اللہ تعالے نے تینوں دعائیں قبول کیں۔[1] اس کے ساتھ ہی ان کے کردار کے بعض پہلوؤں پر انگشت نمائی بھی کی گئی ہے

ابن الجوزی اور بعض دیگر مصنفین نے خطیب بغدادی کی تصانیف کی تعداد ۵۶ بیان کی ہے۔[2] لیکن سبکی اور ابن کثیر نے ۶۰ کے لگ بھگ بتائی ہے، اور ابن خلکان، ابو الفداء، اور سمعانی نے ان کی سو کے قریب تصانیف کا ذکر کیا ہے، الذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں سمعانی کے حوالہ سے ان کی تصانیف کی خاصی طویل فہرست دی ہے، اور پھر اس میں بعض تصانیف کا خود اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے،[3] یوسف العش نے اپنی تصنیف میں ان کی تصانیف کی فہرست مع ان کے موضوعات اور ان کے بارے میں بعض ضروری معلومات کے درج کی ہے، سبکی نے لکھا ہے کہ ان کی بعض تصانیف ان کی موت کے بعد ضائع ہوگئیں، اور لوگوں کی نظروں سے نہیں گزریں، ان کی جو تصانیف اب تک طبع ہوئی ہیں، ان کی تعداد بہت کم ہے، مولانا آزاد لائبریری اور لائبریری ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں ان کی چار مطبوعہ کتابیں تاریخ بغداد، التطفیل وحکایات الطفیلین واخبارہم، الکفایۃ فی علم الروایۃ، اور تقیید العلم موجود ہیں، ان کے علاوہ ایک کتاب تاریخ مدینۃ بغداد کے نام سے ہے، جو تاریخ بغداد کا ملخص ہے، اسے پیرس سے ۱۹۰۴ء میں جارج سالمن نے مع فرانسیسی ترجمہ کے شائع کیا ہے، ایک اور اختصار علی ظریف الاعظمی نے شائع کیا ہے، یہ بغداد سے ۱۳۴۴ھ میں شایع ہوا ہے، اور مولانا آزاد لائبریری کے ذخیرہ حبیب گنج میں موجود ہے، جہاں تک میرا علم ہے، ان کے علاوہ ان کی کوئی اور کتاب

[1] الذہبی تذکرۃ الحفاظ۔ ۳: ۱۱۳۹ [2] یاقوت الحموی۔ ارشاد الاریب [3] الذہبی: تذکرۃ الحفاظ ۳: ۱۱۳۹-۴۰

مطبوعہ صورت میں موجود نہیں ہے، یاقوت الحموی اور ابن الجوزی نے ابو الحسن ابن الطیوری کی روایت نقل کی ہے کہ خطیب بغدادی کی اکثر تصانیف علاوہ تاریخ بغداد کے صوری (محمد بن علی بن حسین) کی کتابوں سے ماخوذ ہیں، صوری نے ان کا آغاز کر دیا تھا لیکن انہیں مکمل نہیں کر سکے تھے، پس خطیب جب شام پہنچے تو ان کی کتابیں حاصل کیں اور ان سے استفادہ کر کے اپنی کتابیں تصنیف کیں۔[1] خطیب شاعر بھی تھے، یاقوت الحموی نے ارشاد الاریب میں اور یوسف العش نے اپنی تصنیف میں ان کے متعدد شعر نقل کیے ہیں،

خطیب کی تصانیف میں تاریخ بغداد کو سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، یہ ۱۳۴۹ھ میں ۱۴ جلدوں میں مصر سے شائع ہوئی، یہ ان علماء کے حالات میں ہے، جو بقول خود خطیب کے "بغداد میں پیدا ہوئے، یا کہیں اور پیدا ہوئے، لیکن بغداد میں آ بسے یا بغداد چھوڑ کر کہیں اور جا بسے اور وہیں وفات پائی یا بغداد کے قرب وجوار میں رہتے تھے یا بغداد کے باشندے تو نہیں تھے، لیکن وہاں کچھ مدت کے لئے آئے تھے،[2] اس میں بغداد کے قیام (۱۴۶ھ) سے مصنف کے سال وفات (۴۶۳ھ) تک کے علمائے بغداد کا احاطہ کیا گیا ہے، کتاب کے آغاز میں بغداد کے تاریخی وجغرافیائی حالات اور اس سے متعلق بعض دوسری ضروری معلومات بیان کر دی گئی ہیں، شروع میں ایسے صحابہ کرام کا ذکر ہے، جن کا عراق سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق رہا ہے، سب سے پہلا نام حضرت علی رضی کا ہے، اسکے بعد اصل کتاب باعتبار حروف تہجی شروع ہوتی ہے، لیکن اس میں بھی ان لوگوں کا ذکر بغرض حصول برکت پہلے کیا ہے، جن کا نام "محمد" ہے، راقم الحروف کے جد امجد مولانا

[1] یاقوت الحموی: ارشاد الاریب ابن الجوزی: المنتظم۔
[2] الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد ۱: ۲۱۲ (قاہرہ ۱۳۴۹ھ)

مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم نے ۱۳۵۳ھ میں ایک خاص نقطۂ نظر سے تاریخ بغداد پر تفصیلی تبصرہ لکھا تھا، جو رسالہ کی شکل میں شائع ہوگیا ہے اس میں انھوں نے لکھا ہے "روش تاریخ مروجہ طریقہ سے علیحدہ ہے، بجائے خلفاء و امراء کو مستقل موضوع قرار دیکر ان کے حالات بیان کرنے کے رجال تاریخ کا ذکر بہ ترتیب حروف تہجی کیا ہے، اسی سلسلہ میں اپنے اپنے موقع سے خلفاء و امراء بھی آجاتے ہیں، رجال کے سلسلہ میں ہر فن اور ہر علم کے ماہرین مذکور ہیں، مفسرین و محدثین و فقہاء سے لیکر شعراء و مصنفین و اہل صنعت تک سب ہی کا ذکر ہے، اس طرح ۷۸۳۱، مشاہیر رجال کا تذکرہ ملتا ہے"[۱] مولانا شروانی نے اس کتاب پر اس نقطۂ نظر سے تنقید کی تھی کہ اس میں امام ابو حنیفہ اور ان کے دو نامور شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد پر جو جرح کی گئی تھی، اس کا رد کیا جائے، اس کے باوجود انھوں نے خطیب کے اسلوب اور مورخانہ خوبیوں کی اس طرح داد دی ہے "تاریخ خطیب جس طرح بہترین زمانے کی تاریخ ہے، اسی طرح طرز بیان کے اعتبار سے مسلمان مورخین کی تصنیف کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے، الفاظ بقدر معنی استعمال کئے ہیں، عبارت آرائی و مدح طرازی کا نام نہیں، بیان صاف اور متین ہے، جرح و تعدیل دونوں بے لاگ ہیں، اگرچہ بعض معرکۃ الآراء مقامات میں قوت فیصلہ کی کمی نمایاں ہے، محدثانہ روایات ہیں، ادیبانہ مبالغہ اور منطقیانہ تذبذب پاس نہیں"[۲]

مولانا شروانی نے اس رسالہ میں یہ اطلاع بھی دی ہے "اس تاریخ کا خلاصہ بھی کیا گیا تھا، اس کا ایک قلمی نسخہ میرے یہاں ہے، یہ خلاصہ فل اسکیپ کے ۳۰۱ صفحات پر ختم ہوا ہے، خلاصہ نگار قاضی ابو الیمن مسعود بن محمد بخاری حنفی المتوفی ۴۶۱ھ خطیب کے

[۱] شروانی، حبیب الرحمن خان۔ تبصرہ بر تاریخ خطیب بغدادی۔ ۶ (علی گڑھ ۱۳۵۶ھ)

شاگرد ہیں، ۔۔۔۔ واضح ہو کہ کل رجال خلاصہ کی تعداد چند صدی سے متجاوز نہ ہوگی، منتخب شعر وغیرہ مستقل عنوان میں"[۱] یہ نسخہ راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے، اس میں ہر صفحہ پر ۲۲ سطریں ہیں، سائز ۸ × ۱۳ ہے، اس کے کاتب مولانا عبداللہ سورتی ہیں، سنہ کتابت ۱۳۳۱ھ ہے، خط نستعلیق صاف ہے، مولانا سورتی نے چند حواشی بھی لکھے ہیں، سرورق پر ایک نوٹ دیا ہے جس میں لکھا ہے کہ کشف الظنون میں ابو الیمن کا سنہ وفات ۵۷۶ھ بیان کیا گیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ ان کی وفات ۴۹۱ھ میں ہوئی، ابو الیمن نے اپنے دیباچہ میں تاریخ خطیب کی تعریف لکھی ہے، لیکن ساتھ ہی لکھا ہے "طویل زیادہ ہے اس لئے میں نے منتخب رجال کے (بہ ترتیب اصل کتاب) حالات مختصراً نقل کئے ہیں"[۲]

تاریخ بغداد کا ایک اختصار "مختار مختصر" کے نام سے آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں بھی موجود ہے، (فہرست جلد ۳ ص ۳۳۰، نمبر کتاب ۲۱۹ رجال) یہ اختصار یحییٰ بن علیسی بن جزلۃ الحکیم نے کیا ہے، یہ دو جلدوں میں ہے پہلی جلد ۱۰ صفحات اور دوسری جلد ۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، دوسری جلد کے آخر میں تاریخ کتابت ۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۴ھ درج ہے، اور اس کے بعد یہ عبارت ہے،

وقد نقل من نسخة قديمة مرقومة سنة اثنتين وخمسين وسبع مائة

(۵۲،)

کتاب کا سائز ۸ × ۱۳ ہے اور ہر صفحہ پر ۲۳ سطریں ہیں، خط نستعلیق صاف ہے لیکن دونوں نسخوں کے کاتبوں کا نام دیا ہوا نہیں ہے، اختصار کنندہ نے کتاب کے مقدمہ میں قاضی ابو الیمن کے اختصار کا ذکر کیا ہے کتاب کی تعریف کی ہے، لیکن طوالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اختصرته وذكرت أسماء الرجال الذين ذكرهم على ترتيبه (باقی)

[۱] مرجع سابق: ۲　[۲] الخطیب البغدادی۔ کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ، ۴۴ (دائرۃ المعارف، حیدرآباد، ۱۳۵۷ھ)

امام مزنیؒ

حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی دریابادی، رفیق دارالمصنفین

امام شافعی کے ممتاز اصحاب اور ان کی فقہ کو نامور راویوں میں امام مزنی اور امام ربیع بن سلیمان مرادی کا نام سرفہرست ہے، فقہ شافعی میں ان حضرات کی وہی حیثیت ہے، جو فقہ حنفی میں امام ابویوسف اور امام محمد کی ہے، لیکن اس کے باوجود ان دونوں کا تذکرہ بہت کم ملتا ہے، سطور ذیل میں سوانح و طبقات کی کتابوں کی مدد سے امام مزنی کے حالات اور علمی کارناموں کو پیش کیا جارہا ہے، آئندہ امام ربیع کے سوانح حیات بھی پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ (ع۔ ص)

نام و نسب اسمٰعیل بن یحییٰ نام، ابوابراہیم کنیت، عرب کے مردم خیز قبیلہ مزنیہ تمیم سے نسبی تعلق رکھتے ہیں، یہ نامور قبیلہ عثمان اور اوس دو بھائیوں کی اولاد پر مشتمل ہے، مزنیہ بنت کلب ان کی والدہ تھیں[1]

صحابہ کرامؓ میں حضرت عبداللہؓ بن مغفل، حضرت معقلؓ، حضرت نعمانؓ بن مقرن وغیرہ اسی قبیلہ کے نامور فرزند ہیں۔[2] صاحب تاج العروس نے مشہور شاعر کعب بن زہیر بن ابی سلمیٰ کو اسی قبیلہ میں شمار کیا ہے، تابعین میں معاویہ بن قرہ، بکر بن عبداللہ اور خالد بن عبداللہ

[1] الانساب۔ سمعانی ج ۲ ص ۵۲۰، [2] اللباب فی الانساب۔ ابن اثیر ج ۳ ص ۱۳۲

طحاوی جیسے جلیل القدر حضرات بھی قبیلہ مزنیہ کی طرف منسوب ہیں[1]۔ مزنی کے ذکر میں علامہ ذہبی نے اس نسبت کی ایک اور توجیہ بھی کی ہے، ان کا بیان ہے کہ سمرقند کا ایک قریہ مُزن یا مُزنر کے نام سے مشہور ہے، محدث شہیر احمد بن ابراہیم مزنی اور دوسرے مشاہیر اسی قریہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس نسبت کے لوگ (بسکون زا) مزنی کہلاتے ہیں[2] اور قبیلہ مزنیہ سے تعلق رکھنے والے (بفتح زا) مزنی کہلاتے ہیں لیکن یہ بیان ایک امکانی توجیہ سے زیادہ نہیں ہے، امام مزنی جن کے حالات ہم بیان کر رہے ہیں وہ قبیلہ مزنیہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور مزنی کہلاتے ہیں۔

پیدائش امام مزنی ۱۷۵ھ میں مصر میں پیدا ہوئے، سارے سوانح نگار اس سنہ پر متفق ہیں،[3] لیکن علامہ سبکی نے ربیع مرادی (امام مزنی کے رضاعی بھائی) کے حالات میں امام طحاوی کی رائے کسی قدر مختلف نقل کی ہے، ان کا بیان ہے کہ بحر بن نصر ربیع مرادی اور مزنی تینوں ایک ہی سنہ یعنی ۱۷۴ھ میں پیدا ہوئے، طحاوی، امام مزنی کے بھانجے ہیں، اس لئے ان کے بیان کو اہمیت دی جانی چاہئے، مگر دوسرے مورخین کا کیا ذکر خود سبکی نے بھی اس پر زور نہیں دیا، اور سرسری طور پر ذکر کر دیا، اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ روایت زیادہ قوی نہیں ہے، اور عام سوانح نگاروں ہی کا بیان صحیح ہے۔

نشوونما امام مزنی کی نشوونما اور ابتدائی تعلیم و تربیت کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے کوئی تفصیل بیان نہیں کی ہے، ان کے خاندانی حالات بھی پردۂ خفا میں ہیں،

[1] المغنی۔ پٹنی ص ۷۰، [2] تاریخ اسلام۔ ذہبی ج ۲ ص ۴۴ [3] طبقات۔ ابن ہدایہ۔ ص ۵، سبکی۔ ج ۱ ص ۲۳۸، ابن شہبہ قلمی ص ۳۰۲ موجود خدا بخش لائبریری پٹنہ، توالی التاسیس ص ۱۴ وغیرہ

والد کے مشاغل کا بھی کتابوں میں کوئی تذکرہ نہیں ہے، صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ مصر کے رہنے والے تھے، مصر پورے ملک کو بھی کہتے تھے، اور اس نام کا شہر بھی تھا، جو فسطاط کے قریب تھا، اسلامی فتوحات سے پہلے اسے بڑی مرکزیت حاصل تھی، فاطمیوں کے زمانہ میں قاہرہ آباد ہوا تو وہ مصر کا دارالسلطنت قرار پایا، اور ایسی ترقی کی کہ پھر کوئی دوسرا شہر اس کا ہمسر نہ رہا، لیکن مصر و فسطاط اب بھی تاریخی اہمیت رکھتے ہیں، مزنی کے زمانہ میں مصر بہت بارونق تھا، اور تفسیر و حدیث اور فقہ و کلام کے بڑے بڑے ائمہ یہاں مقیم تھے، اور تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف اور بحث و نظر کے مستقل حلقے قائم تھے لیکن حدیث کی طرف خاص توجہ تھی۔

امام لیث بن سعد، نعیم بن حماد، مفضل بن فضالہ، حیوہ بن شریح، یحییٰ بن ایوب اور عمرو بن حارث جیسے اکابر ائمہ حدیث یہاں موجود تھے، اور ان کی وجہ سے یہ علاقہ طالبان علوم حدیث کی خصوصی توجہ کا مرکز تھا[1] اس ماحول میں امام مزنی نے شعور کی آنکھیں کھولیں، اللہ تعالیٰ نے حفظ و ذہانت سے خوب نوازا تھا، تھوڑے ہی عرصہ میں وہ اہل علم کی توجہ کا مرکز بن گئے، یوں تو وہ سبھی ائمہ حدیث سے اکتساب فیض کرتے تھے لیکن نعیم بن حماد سے زیادہ مناسبت تھی، نعیم بن حماد کے علمی کمال اور جلالت شان کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ امام ترمذی، دارمی اور امام بخاری کے راوی ہیں، وہ اصحاب رائے کے طرز عمل کو پسند نہیں کرتے تھے، اور قیاس و رائے کے بجائے صرف حدیث کے الفاظ کو پیش نظر رکھتے تھے، اس بنا پر محدثین کے حلقہ میں ان کی بڑی عزت تھی، ان کی صحبت میں مزنی کو اصحاب حدیث سے بڑا تعلق پیدا ہوا،

۱؎ خطط۔ مقریزی، ص ۱۴۵،

نعیم بن حماد کے علاوہ امام مزنی نے علی بن معبد العبدی سے بھی سماعت حدیث کی، ان کا شمار بھی اہم محدثین میں ہوتا ہے، علی بن معبد کے اساتذہ میں مالک بن انس، خالد بن حیان، سفیان ابن عیینہ اور عبد اللہ ابن مبارک اور تلامذہ میں امام مزنی کے علاوہ اسحاق بن منصور، ابن معین اور محمد بن اسحاق صغانی کی سی عظیم المرتبت ہستیوں کے نام آتے ہیں، امام مزنی نے اپنی کتاب مختصر المزنی کے باب الاضحیۃ میں ان کا ذکر کیا ہے، لیکن امام نووی کا خیال ہے کہ یہ ان کے ہم نام علی بن معبد الصغیر ہیں[2]

مصر میں امام شافعی کی آمد

سماعت حدیث کا سلسلہ جاری تھا، اور امام مزنی کبار محدثین سے استفادہ کر رہے تھے، کہ امام شافعی کی مصر میں آمد آمد کا غلغلہ بلند ہوا، مصر میں امام شافعی کی یہ تشریف آوری اس وقت ہوئی جب ان کی شہرت کا آفتاب نصف النہار تک پہنچ چکا تھا، اور اس کی ضیاباری سے ایک عالم پُرنور تھا، وہ یمن، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور عراق سے گذر کر یہاں پہونچے تھے، وہ امام مالک کی خدمت میں بھی رہے تھے، امام محمد کے یہاں بھی انھوں نے ان بزرگوں سے استفادہ بھی کیا تھا، اور ان کے افکار و خیالات پر ناقدانہ نگاہ بھی ڈالی تھی، وہ عراق و حجاز، اور دوسرے علمی مراکز کے نقطۂ نظر سے بخوبی آگاہ تھے، اور ان ائمہ کے مسلک، ان کے اجتہاد اور طرز استدلال کو اچھی طرح سمجھتے اور اپنے علم و بصیرت کی روشنی میں ان پر نقد بھی کرتے تھے، ان خصوصیات کی بنا پر وہ سارے اہل علم کی توجہ کا مرکز بن گئے، مصر میں ان کا بڑا خیر مقدم ہوا، اور ان کا کاشانہ شائقین علم کا مرکز عقیدت بن گیا، مزنی نے بھی ان کی خدمت میں حاضری کو اپنے لیے باعث سعادت جانا اور علم کے اس بحر ذخار سے اپنی تشنگی کی سیرابی اور ذہنی آسودگی کی کوشش کی

۲؎ تہذیب الاسماء۔ نووی ج ۱ ص ۳۵۲، تہذیب عسقلانی جلد ۷ ص ۳۸۴

امام شافعی کے فیض سے اب وہ محض حدیث کے سامع اور راوی نہ تھے بلکہ کتاب وسنت کے اسرار و رموز سے آگاہ ہوگئے، اجتہاد و استدلال کی نئی راہیں ان پر منکشف ہوئیں[۱] اور انھوں نے امام شافعی کے علم و اجتہاد کو سارے عالم میں پھیلا دیا، اور نہ صرف مصر بلکہ سارے بلاد اسلامیہ میں فقہ شافعی کی اشاعت و ترویج کا اہم ذریعہ بن گئے۔ ان کے بارے میں بجا طور پر کہا جاتا ہے۔

اکبر اصحابنا علماً واعلم
غلمان الشافعی الذی
مهد مذهب ولین کلام
الشافعی[۱]

وہ ہمارے اصحاب میں علم کے لحاظ
سے سب سے برتر اور امام شافعی کے
شاگردوں میں عالم ترین شخص تھے،
جنھوں نے شافعی مسلک کی راہ ہموار
کی اور کلام شافعی کو آسان بنایا،

امام شافعی امام مزنی کی آیندہ فکری و فقہی، ساخت و پرداخت کو سمجھنے کے لیے امام شافعی کے علمی منازل کا مختصر ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے، مدینہ میں امام مالک سے کسب فیض کے بعد امام شافعی ۱۸۴ھ میں بغداد تشریف لائے جو اس وقت فقہ حنفی کا سب سے بڑا مرکز تھا، یہاں انھوں نے امام محمد سے فقہ حنفی کا درس لیا، اثنائے درس میں امام محمد سے تبادلۂ خیالات اور علمی مباحث نے امام شافعی کے علمی و فکری رجحانات پر گہرے نقوش ثبت کیے، اور بقول ابن حجر وہ اہل حدیث اور اہل رائے کے علوم کے جامع بن گئے۔ بغداد میں ان کے قیام کی مدت یقینی طور پر معلوم نہیں ہے، لیکن شیخ ابوزہرہ کا خیال ہے کہ دو برس سے کم ان کا قیام بغداد میں نہیں رہا۔

---

[۱] خطط، مقریزی ص ۳۴۴

قیام مکہ اس کے بعد وہ مکہ معظمہ تشریف لائے، یہاں امام احمد بن حنبل سے ان کی ملاقات ہوئی، ۹ برس یہاں ان کا قیام رہا، مسجد حرام میں باقاعدہ ان کا ایک حلقہ قائم تھا، اس طرح فکر شافعی کی ترویج کا پہلا دور شروع ہوا، ۹ برس کا یہ دور امام شافعی کی حیات علمی کا شاداب ترین دور تھا، ایک تو عمر کے لحاظ سے وہ عقلی پختگی کے حدود میں پہونچ گئے تھے، دوسرے وہ امام مالک اور امام محمد کے اجتہادات اور طرز استدلال سے آگاہ ہو چکے تھے، اور ان کی روشنی میں بحث و نظر کے ایک نئے رُخ کی تعیین میں کامیاب ہو چکے تھے، اپنے علمی اسفار کی بنا پر علماء کے مختلف آراء و افکار سے واقفیت کے علاوہ انہیں حدیث کے وسیع لیکن منتشر ذخیرہ کی فراہمی کا بڑا موقع ملا، جس سے اصول کی تشکیل، مسائل کے تجزیہ و تحلیل، تفریع و تشریح اور استنباط و اجتہاد میں اصابت رائے اور فیصلہ محکم کی صلاحیت پورے طور پر نمایاں ہو چکی تھی، امام احمد بن حنبل نے جو مکہ میں ہی مقیم تھے، اور ابن عینیہ کے حلقوں سے اٹھ کر امام شافعی کی مجلسوں میں شریک ہونے لگے تھے، اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے کہ "فقہ کا قفل بند تھا، اللہ تعالیٰ نے شافعی کے ذریعہ اسے کھلوا دیا" مکہ معظمہ میں نو برس قیام کے بعد امام شافعی دوبارہ ۱۹۵ھ میں بغداد تشریف لائے، اس مرتبہ تقریباً ۳ برس قیام رہا، اس عرصہ میں ان کی علمی اور فقہی کسوٹی کے لیے وسیع تر مسائل پیش ہوئے، مثلاً امام ابو حنیفہ اور ابن ابی لیلیٰ کے اختلافات کا تجزیہ، واقدی، اور اوزاعی کا تقابلی جائزہ اور خود اپنے اصولوں پر غور و نقد کا عمل، اس طرح بغداد کے اس قیام کو بجا طور پر امام شافعی کے فقہی سفر کی دوسری منزل قرار دیا جاتا ہے،

مصر کا سفر تکمیل و تاسیس کی تیسری اور آخری منزل کے لیے سرزمین مصر مقدر ہو چکی تھی

بغداد سے مصر کی ہجرت کے اسباب میں کاتب تقدیر کی مصلحت بینی کے علاوہ خلیفۂ وقت مامون کے عقائد معتزلہ کا روز افزوں اقتدار اور علوم اسلامیہ میں علم کلام کی تیزی کے ساتھ اثر پذیری کو بھی دخل ہے، یہ امر قرین قیاس ہے کہ ان حقائق کی موجودگی میں امام شافعی کی دوررس نظروں سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی، کہ کسی بھی مکتب فکر کی تاسیس و تکمیل کے لیے جس قسم کی یکسوئی اور فراغ خاطر درکار ہے، بغداد میں اس کی گنجایش دور دور نظر نہیں آتی، ان کے علوم و معارف اور تفقہ و اجتہاد کی راہ خطرات سے دوچار تھی، ایسے موقع پر امام شافعی کی فراست نے انھیں مصر کی طرف ہجرت کی صلاح دی، انھوں نے بغداد سے روانگی کے وقت جو اشعار کہے ہیں ان سے بھی اس تعبیر کو تائید حاصل ہوتی ہے،

لقد اصبحت نفسی تتوق الی مصر　　ومن دونها قطع المهامه والقفر

فوالله ما ادری الفوز والغنی　　اساق الیها ام اساق الی القبر

ترجمہ: میرا دل مصر کے لیے مشتاق ہے، حالانکہ اس کی راہ میں دشواریاں ہیں بخدا میں نہیں جانتا کہ کامرانی و بے نیازی کے لیے لے جایا جا رہا ہے یا مصر کی خاک میں مدفون ہونے کے لیے،

قیام مصر کی اہمیت

جو لوگ امام شافعی کی فراست، فہم اور تفقہ سے واقف ہیں ان کے لیے یہ بات باعث حیرت و استعجاب نہیں ہے کہ قیام مصر نے امام شافعی کے امید و اندیشہ دونوں کا جواب اثبات میں دیا، سرزمین مصر اس آفتاب عالمتاب کو اپنی آغوش میں لے کر جہاں رشک افلاک بن گئی، وہیں اسے علوم شافعیہ کے ایک نئے آفتاب کے طلوع کی سعادت بھی حاصل ہوگئی، فقہ شافعی کی ساری عطر بیزی اسی چہار سالہ قیام مصر کا نتیجہ ہے، فقہ شافعی کی نمود تکمیل، اس کی تشکیل و تشریح

اور اشاعت و تدریج کے مراحل کی تعیین مصر ہی میں ہوئی، اور یہیں اس نے استحکام حاصل کیا۔

اصحاب مصر

امام شافعی کی فقہ کے فروغ میں ان کے مصری شاگردوں کی بڑی اہمیت ہے، امام شافعی اپنے تلامذہ و اصحاب کے باب میں بہت خوش قسمت ہیں کہ ہر دور میں بڑے باصلاحیت، حوصلہ مند اور مخلص ترین رفقا کی ایک جماعت کثیر ان کے دامن علم سے وابستہ رہی، مکہ معظمہ کے قیام کے دوران ابوبکر حمیدی، موسیٰ بن ابی الجارود، ابوبکر محمد بن ادریس اور بغداد کی مجالس میں زعفرانی، کرابیسی، ابوثور کلبی اور مصر کے آخری دور میں حرملہ بن یحیی، بویطی، ابن عبدالحکم، ربیع جیزی، ربیع مرادی، اور مزنی جیسے نادرۂ روزگار تلامذہ ان کے دامن فیض سے وابستہ رہے[1] مصری رفقا کی حیثیت اس لیے اور اہم ہو جاتی ہے کہ فقہ شافعی کے سارے مستند مقبول اور متداول سرمایہ کے امین و پاسبان ان کے علم کے حامل اور ان کے تنقیح شدہ مسائل کے ترجمان یہی اصحاب مصر ہیں اور اس گنج گرانمایہ کا گوہر آبدار اور مصر کے بازار علم کی متاع بیش بہا امام مزنی کی ذات صد افتخار ہے۔

مزنی کی امام شافعی سے ملاقات

علامہ سبکی نے "کوہ علم مسلک شافعی کا ناصر و مددگار، اور آسمان شافعی کے ماہ کامل[2]" کے بظاہر مبالغہ آمیز الفاظ سے ان کا ذکر کیا ہے، لیکن امام مزنی کی شخصیت کی جلوہ طرازی خود اعلان کرتی ہے کہ آسمان شافعی کے بدر کامل کی یہ تعبیر مبالغہ سے قطعاً پاک ہے، مصر میں امام شافعی کی آمد کے وقت امام مزنی کی عمر صرف ۲۴ برس کی تھی،

---

[1] توالی التاسیس، عسقلانی، الانتقاء، ابن عبدالبر اور شافعی، ابوزہرہ وغیرہ سے ملخصاً

[2] طبقات سبکی ج ۱ ص ۲۳۸

نوعمری میں وہ نعیم بن حماد، علی بن معبد جیسے کبار اساتذۂ حدیث سے اکتساب علم کر چکے تھے، لیکن انھیں علمی سیرابی کے لیے کسی بحر ذخار کی ضرورت تھی، امام شافعی کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو انھیں اس بحر ناپید اکنار میں شناوری کا ڈھنگ آیا،

امام شافعی سے ان کی پہلی ملاقات کب، کہاں اور کیسے ہوئی؟ اس کا ذکر تصریح سے نہیں ملتا، لیکن اندازہ ہے کہ امام شافعی کی مصر میں تشریف آوری کے ساتھ ہی امام مزنی ان کی خدمت میں حاضر ہوگئے ابن حجر کے الفاظ "لزم الشافعی حین قدم مصر"[1] سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے، ابتدا میں وہ امام شافعی کی مجلسوں میں شاید ان کے کلام کے سننے کے شوق اور پیچیدہ علمی مسائل کے بارے میں استفسار کی غرض سے حاضر ہوتے، گو وہ اس وقت حدیث کے طالب علم تھے، اور مصر میں اس وقت اسی کا دور دورہ تھا، لیکن بغداد سے بُعد مسافت کے باوجود مصر، بغداد کے جدید علمی رجحانات سے بالکل غیر متاثر نہ تھا، علم کلام نئے ذہنوں کے لئے خاصا پرکشش تھا، امام مزنی کا کلامی طرز فکر و استدلال سے متاثر ہونا قرین قیاس ہے، چنانچہ امام شافعی سے مسائل کے استفسار میں ان کا انداز اہل کلام کا سا ہوا کرتا تھا، امام شافعی علم کلام اور متکلمین کے بارہ میں بہت سخت تھے، اس موقع پر ان کا یہ قول لائق ذکر ہے،

حکمی فی اہل الکلام ان	اہل کلام کے بارے میں میرا فیصلہ
ان یضربوا بالجرید و	یہ ہے کہ انھیں چھڑیوں سے مارا جائے
یحملوا علی الابل ویطاف	اور اونٹوں پر بیٹھا کر بستیوں اور
بھم فی العشائر والقبائل	قبیلوں میں پھرایا جائے، اور
وینادی علیہم ھذا جزاء	پکار پکار کر کہا جائے کہ یہ سزا

۱؎ توالی التاسیس ص ۸۰۔

من ترک الکتاب و السنۃ[1]	کتاب و سنت کے ترک کی پاداش ہے،

کچھ علم کلام سے ناپسندیدگی اور کچھ امام مزنی کی پوشیدہ فقہی صلاحیتوں سے آگاہی کے سبب امام شافعی کو مزنی کا یہ کلامی انداز پسند نہ آیا، اور ایک روز جب کہ مزنی نے چند کلامی مباحث چھیڑے، تو امام شافعی نے ان کو مطمئن کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ ایسا علم ہے کہ اگر تم جادۂ صواب پر رہے تو بھی اجر کا موجب نہیں اور اگر کسی غلطی اور لغزش کا ارتکاب ہوا تو بات کفر کی حد تک پہونچ سکتی ہے، آخر تم ایسا علم کیوں نہیں اختیار کرتے جو تمھارے لیے باعث خیر ہو کہ صحت و صواب ہر صورت میں مستحق ثواب ہو اور خطا و غلطی کی شکل میں وبال سے محفوظ رہو" فہل لک فی علم ان اصبت فیہ اجرت وان اخطأت لم تاثم؟ مزنی نے عرض کیا وہ کیا، فرمایا، علم فقہ، امام مزنی خود فرماتے ہیں کہ

فلزمتہ و تعلمت منہ	پھر میں ان کی خدمت میں لگ گیا،
الفقہ ودرست علیہ[2]	ان سے فقہ کا علم حاصل کیا،

اسی قسم کے ایک موقع پر امام شافعی نے فرمایا،

سلنی عن شیء اذا اخطأت	مجھ سے ایسی چیز کے متعلق سوال
فیہ قلت اخطأت ولا	کرو کہ اگر تم غلطی کرو تو میں کہوں
تسئلنی عن شیء اذا اخطأت	تم نے غلطی کی، ایسی چیز کے بارے
فیہ قلت کفرت[3]	میں مت پوچھو کہ اگر تم سے خطا ہو
	تو میں کہوں تم کفر کے مرتکب ہوئے

اسی سیاق میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ ایک روز امام شافعی کی نشست میں

۱؎ معجم المصنفین ص ۲۰۰، ۲؎ طبقات سبکی ج ۱ ص ۲۴۱ ۳؎ معجم المصنفین ۲۰۰

حفص فرد موجود تھے، دونوں حضرات کے مابین دقیق قسم کے کلامی مباحث پر گفتگو ہو رہی تھی مزنی کا اعتراف ہے کہ ابہام اور پیچیدگی سے یہ باتیں میری فہم کی گرفت سے بالاتر تھیں کہ اچانک امام شافعی تیزی سے مزنی کی جانب متوجہ ہوئے، اور فرمایا۔

یا مزنی تدری ما قال	اے مزنی تم سمجھے کہ حفص نے کیا کہا
حفص قلت لا قال خیر لک	میں نے کہا نہیں، فرمایا، تمھارے لیے
ان لا تدری[1]	نہ سمجھنا ہی بہتر ہے۔

اس طرح امام شافعی نے مزنی کی قوت استدلال، صلاحیت استحضار اور دقیقہ سنجی، نکتہ رسی، معاملہ فہمی اور قوت فیصلہ کی فطری اور خداداد صلاحیتوں کا اندازہ کرنے کے بعد اپنی ساری توجہ ان کی فقہی صلاحیتوں کی تربیت و ترقی پر مرکوز کردی، چار برس کی محنت اور توجہ کے بعد امام شافعی کے جذبات کا ان کے حق میں اظہار ان الفاظ میں ہوا، جو کسی بھی شاگرد کے لیے باعث صد افتخار ہیں، فرمایا۔

هذا لو ناظر الشیطان	یہ اگر شیطان سے مناظرہ کریں
لغلبه وقطعه وهو ناصر	تو اس پر غالب آجائیں، اور اسے
مذهبی[2]	ختم کردیں، یہ میرے مسلک کے ناصر
	و مددگار ہیں،

امام شافعی کی دور بین اور دوررس نگاہوں نے اپنے اس نوجوان اور ہونہار شاگرد کی مستقبل میں کامیابی کو بہت قریب سے دیکھ لیا تھا، چنانچہ امام صاحب کی

---

[1] طبقات سبکی ج ۱، ص ۲۴۱، [2] وفیات الاعیان۔ ابن خلکان ص، طبقات شیرازی ص ۷۹، اسنوی قلمی موجود خدا بخش لائبریری ص ۸،

وفات کے وقت جب ان کے چاروں مصری تلامذہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ایک لمحہ کے لیے امام شافعی اپنے لگائے ہوئے چمن کے ان سرسبز و شاداب پودوں کو جن کی آبیاری میں انھوں نے اپنا سارا سرمایہ حیات اور خون جگر صرف کیا تھا دیکھتے رہے، پھر متوجہ ہو کر ہر ایک کے بارے میں پیشین گوئی فرمائی، فرمایا

اما انت یا ابا یعقوب	اے ابو یعقوب (بویطی) تمھارا وقت
فستموت فی حدیدک	موعود آئے گا، اور تم بیڑیوں میں
واما انت یا محمد فسترجع	ہوگے، اور اے محمد (ابن عبد الحکم)
الی مذهب ابیک و	تم اپنے والد کے مسلک پر لوٹ جاؤ گے
اما انت یا ربیع فانت	اور اے ربیع (مرادی) تم میرے
انفعهم لی فی نشر الکتب	لیے کتابوں کے نشر میں نافع ترین
واما انت یا مزنی فسیکون	شخص ہوگے اور اے مزنی بہت جلد
لک بمصر هنات وهنات	مصر میں تمھارے لیے خوب خوب
ولتدرکن زمانا تکون	خوشگواریاں ہوں گی اور وہ
اقیس ذلک الزمان	زمانہ ضرور پاؤ گے، جس میں تم سب سے
قال الربیع فکان کما قال[1]	بڑے فقیہ ہوگے، ربیع کہتے ہیں جیسا
	فرمایا ویسا ہی ہوا،

ایک سعادت مند شاگرد کے لیے اس سے بڑھ کر اس کی عظمتوں اور کامیابیوں کی ضامن و شاہد سند اور کیا ہوسکتی ہے، تاریخ شاہد ہے کہ مصر کے علاوہ عراق، شام،

---

[1] طبقات، سبکی ص ۲۳۶

خراسان اور اندلس وغیرہ دیار، شرق وغرب میں فقہ شافعی کا فروغ امام مزنی، اور ان کے تلامذہ کا رہین منت ہے، [۱]

امام شافعی کی حکیمانہ تربیت

اپنے اقوال وافعال سے شعوری وغیر شعوری طور پر شخصیت کی تعمیر میں امام شافعی کو جو ملکۂ خاص ودیعت ہوا تھا، اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے، امام مزنی ان کی خلوت وجلوت کے شریک تھے، ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے، کہ امام شافعی اپنے تلامذہ کو اخلاق عالیہ کی تعلیم کتنے حکیمانہ انداز سے دیتے تھے، مثلاً ایک روز ایک خیاط امام شافعی کی خدمت میں حاضر ہوا، امام صاحب نے کسی لباس میں رفو کرایا، اور ایک دینار دیدیا، خیاط، دینار دیکھکر ہنسا، امام صاحب نے فرمایا اسوقت یہی لے لو اگر اور دینار ہوتے تو میں ضرور دیتا، اس پر خیاط نے کہا میں تو صرف سلام کی غرض سے حاضر ہوا تھا، امام شافعی نے فرمایا تب تو زائر بھی ہو، اور مہمان بھی ہو، اور ان دونوں سے خدمت لینا، شرافت نہیں، ایسے ہی ایک موقع پر امام شافعی چند تیر اندازوں کے پاس سے گزرے، ایک تیر انداز بڑا ماہر اور کہنہ مشق تھا، اس کی بے خطا نشانہ بازی سے امام شافعی خوش ہوئے دعا دی اور مزنی سے فرمایا جیب میں کچھ ہے؟ امام مزنی کے پاس اتفاق سے تین ہی دینار تھے، امام شافعی نے وہ تینوں دینار، بطور انعام اس تیر انداز کو مرحمت کر دیئے، امام مزنی ان واقعات کو لطف لے لے کر دہراتے تھے، [۲] ان واقعات کی روشنی میں انھوں نے اپنی زندگی کو حسن اخلاق کے زیور سے آراستہ کیا،

امام مزنی کے شعری ذوق میں امام شافعی کا پرتو

امام مزنی کو شعر وادب سے جو ذوق تھا وہ

[۱] طبقات السبکی ج ۱ ص ۲۳۹ [۲] توالی التاسیس ص الانتقاء ص ۹۴، ۹۵،

تمامتر امام شافعی کا عطیہ ہے، ایک بار امام مزنی کی موجودگی میں امام شافعی کی خدمت میں کسی شخص نے غلط انداز اور خراب لے سے چند اشعار سنائے، امام شافعی کی طبیعت مکدر ہوگئی، اور فرمایا "اضرستنی" [۱] (تم نے مجھے کبیدہ خاطر کر دیا)، امام مزنی نے فرمایا ایک بار امام شافعی نے خاص طور سے مجھے یہ اشعار سنائے،

شهدت بان الله لا شی غیرہ　　　　واشهد ان البعث حق وخلص

وان عری الایمان قول مبین　　　　وفعل زکی قد یزید و ینقص

وان ابا بکر خلیفة ربه　　　　وکان ابو حفص علی الخیر یحرص

واشهد ربی ان عثمان فاضل　　　　وان علیا فضله متخصص

ائمة قوم یهتدی بهداهم　　　　لحا الله من ایاهم تینقص [۲]

ترجمہ:- میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے، اور موت کے بعد دوبارہ زندگی حق ہے، ایمان قول مبین کا نام ہے، میرے افعال میں زیادتی ونقصان کا عمل، ہتا ہے، بوبکرؓ اپنے رب کے خلیفہ ہیں، عمرؓ خیر کے آرزومند ہیں، عثمانؓ صاحب فضیلت ہیں اور علیؓ کی فضیلت خاص ہے، یہ حضرات قوم کے امام ہیں، ان کے ذریعہ ہدایت حاصل کی جاتی ہے، خدا اسے غارت کرے، جو ان کی تنقیص کرے،"

ایک بار فرمایا، مزنی! جاہلوں کے نزدیک علم ویسا ناپسندیدہ ہے، جیسا اہل علم کے نزدیک جہل، پھر یہ اشعار سنائے،

ومنزلة الفقیه من السفیه　　　　کمنزلة السفیه من الفقیه

فهذا زاهد فی قرب هذا　　　　وهذا فیه ازهد منه فیه [۳]

[۱] معجم المصنفین ۲۰۸، [۲] طبقات السبکی ص ۱۵۰، [۳] ایضاً

ترجمہ:۔ سفیہ (بیوقوفوں) کے نزدیک فقیہ کی وہی حیثیت ہے جیسی اس کی فقیہ کے نزدیک حیثیت ہوتی ہے، یہ اس کے قرب میں بے رغبت ہے اور وہ اس سے بڑھ کر اس کی ذات سے بے نیاز ہو،

امام شافعی کے دم رخصت جب مزنی حاضر خدمت ہوئے اور مزاج پرسی کی تو فرمایا "دنیا سے رخصت اور دوستوں سے جدا ہو رہا ہوں، اپنے اعمال کی برائیوں کا سامنا اور موت کا جام پینا ہے، بخدا نہیں جانتا کہ میری روح کا رخ جنت کی جانب ہے کہ اسے مبارکباد دوں یا جہنم اس کے سامنے ہے کہ تعزیت کروں" پھر یہ اشعار سنائے،

ولما قسی قلبی وضاقت مذاھبی	جعلت رجائی نحو عفوک سلما
تعاظمنی ذنبی فلما قرنتہ	بعفوک ربی کان عفوک اعظما
فمازلت ذا عفو عن الذنب لم تزل	تجود و تعفو منۃ و تکرما

ترجمہ:۔ جب میرا دل سخت ہو گیا، راہیں مسدود ہو گئیں تو تیرے عفو سے میں نے اپنی امید باندھی، میرے گناہ مجھے بڑے معلوم ہو رہے تھے، لیکن جب میں نے اپنے رب کے عفو و کرم سے ان کا موازنہ کیا تو میرے رب کا کرم زیادہ نکلا، تو نے گناہوں سے ہمیشہ درگذر کیا اور تیرے احسان و انعام کی دولت ہمیشہ جاری رہتی ہے، (باقی)

شذرات ابن ہدایۃ ص ۳ و سبکی ج ۱ ص ۱۵۶

تاریخ فقہ اسلامی

تاریخ التشریع الاسلامی مولفہ علامہ محمد الخضری مرحوم کا ترجمہ جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات بہ تفصیل بیان کی گئی ہیں، (از مولانا عبد السلام ندوی،

ضخامت ۴۰۹ صفحے،

قیمت ۔ ۱۲ ؍ روپے

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

نقش دوام ۔ مرتبہ ۔ مولانا انظر شاہ کشمیری، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت بہت عمدہ صفحات ۲۸۴ مجلد خوشنما وسٹ کور، قیمت تین روپیہ، ناشر شاہ بکڈپو دیوبند ۔ یو ۔ پی،

مولانا انور شاہ کشمیری مرحوم پر اردو اور عربی میں کئی کتابیں شایع ہو چکی ہیں، یہ نئی کتاب ان کے چھوٹے صاحبزادے مولانا انظر شاہ کشمیری استاذ دار العلوم دیوبند کی محنت و کاوش کا نتیجہ ہے، گو وہ اپنے والد بزرگوار کے انتقال کے وقت بہت کم سن تھے، اس لیے ان کی واقفیت ذاتی کم سماعی زیادہ ہے تاہم انھوں نے صاحب سوانح کی سیرت و شخصیت کے خط و خال اور ان کے امتیازی اوصاف و کمالات کو نمایاں کرنے کی پوری کوشش کی ہے، پہلے شاہ صاحب کے وطن، خاندان، ولادت، تعلیم، وفات، اور اولاد وغیرہ کا تذکرہ ہے، اس کے بعد ان کی سیرت و اخلاق، جامعیت، علمی کمالات اور دینی خدمات کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں ان کی وسعت علم و نظر، غیر معمولی حافظہ، درس و تدریس کی اہم خصوصیات، ردّ قادیانیت کے ذکر کے ساتھ ان کے ذوق شعر و سخن، عربی، فارسی اور اردو کلام کے نمونے بھی دیئے ہیں، اور ان کے معاصرین فضلاء کی رائیں بھی نقل کی ہیں، نیز تصنیفات کا تعارف کرایا ہے، آخر میں ان کے تفردات و تحقیقات درج ہیں، جن سے تفسیر، حدیث، فقہ اور کلام کے متعدد اہم مباحث کے متعلق ان کے افکار و خیالات کا علم ہوتا ہے، مصنف نے ان کی کئی مفید تحریروں کے اقتباسات بھی نقل کئے ہیں، جیسے سنہ ء میں پشاور میں ہونے والے جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس کا خطبۂ صدارت دیوبند میں علامہ رشید رضا مصری کی

تشریف آوری کے وقت کا خطبہ اور مقدمۂ بہاولپور میں رد قادیانیت کے متعلق بعض بیانات وغیرہ جن لوگوں کا ذکر کسی تقریب سے کتاب میں آیا ہے، یا دارالعلوم دیوبند یا خود شاہ صاحب سے کسی نوعیت کا تعلق رہا ہے، ان کے مختصر حالات بھی حواشی میں قلمبند کیے گئے ہیں لیکن اکثر تذکرے سنین ولادت و وفات کے ذکر سے خالی ہیں، دارالعلوم دیوبند کی اہمیت اور شاندار خدمات کے بیان میں شعوری یا غیر شعوری طور پر دوسری درسگاہوں اور مکاتب فکر کی تحقیر ہوگئی ہے، جمعیۃ اہلحدیث، جماعت اسلامی، اور ان کے اکابر کا ذکر بھی طعن و تشنیع کے ساتھ کیا گیا ہے، جو نامناسب ہے، مولانا انور شاہ صاحب کی شخصیت علمی حیثیت سے بہت ممتاز تھی، اگر وہ دوسرے شعبوں میں اس قدر ممتاز نہ رہے ہوں تو اس سے ان کی عظمت میں کوئی کمی نہیں ہوئی، مگر مصنف ان کو ہر حیثیت سے ممتاز اور عملی سیاست کا مرد میدان بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ وہ خالص علمی آدمی تھے، مگر اپنے استاذ مولانا محمود الحسن اور دوسرے اکابر کی طرح قوم پرور تھے، ان کی تصنیف مشکلات القرآن کے تعارف کے شروع میں اس کو قلمی بتایا ہے، حالانکہ یہ چھپ گئی ہے آگے خود مصنف نے بھی لکھا ہے کہ دو بار شائع ہوئی ہے، ص۱۰۱ پر شاہ صاحب کی پیدائش کا سنہ ۱۲۹۰ھ اور ص۲۷ پر ۱۲۹۲ھ لکھا ہے، ایک جگہ لکھا ہے کہ ان کی وفات تیرھویں صدی میں ہوئی (ص۹۴) حالانکہ چودھویں صدی ہجری میں ہوئی، سیرت عمر بن عبدالعزیز مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی تصنیف ہے لیکن مصنف نے اس کو مولانا سید سلیمان ندوی رح کی تصنیف بتایا ہے، (ص۲۹۴) مولانا ظفر احمد عثمانی بر صغیر کے ممتاز عالم تھے، دسمبر ۷۴ء میں ان کا انتقال ہوا، یہ خبر ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئی اور تمام اخباروں اور رسالوں میں چھپی، مگر مصنف لکھتے ہیں "غالباً گذشتہ سال پاکستان میں داعی اجل کو لبیک کہا، (ص۱۴۰) پتہ نہیں شک انتقال میں ہے، یا گذشتہ سال میں،

دونوں ہی صورتوں میں یہ بے خبری تعجب خیز ہے، مصنف کی تحریر میں شگفتگی ہے، لیکن بعض جگہ رنگین پیرایۂ بیان کی وجہ سے عبارت بے معنی یا غیر شگفتہ ہوگئی ہے، جیسے "اور جسکے علمی و ذہنی تشکیل میں صاحب سوانح کا فضل و کمال، اخلاص وللّٰہیت خوبی صفات و حسن شمائل بڑے کارگر اور موثر تھے، (ص۲۴۳) حفظ و ذکا کا تابندہ ستارہ (ص۲۰) اصل میں تو صاحب سوانح کے متعلق انکے اعترافات کو جمع کرنا تھا، جن سے ان کے غیر معمولی تبحر اور جودت علمی کی تسلیمی لہر از ہند تا عرب پھیلی ہوئی ہے" (ص۲۹۳) "صبائے اجل نے گرد حیات سے دامن کو فارغ کیا" (ص۲۹۴) "تلمذانہ نسبت رکھتے ہیں" (ص۲۶۹) وہ خود لکھتے ہیں کہ "اب تحقیقی کمال دقت پسندی میں نہیں بلکہ اہم اور دقیق مباحث کو بھی آسان اور سہل بنا دینا امتیاز ہے" (ص۲۹۵) مگر اس کے باوجود عربی کے ثقیل اور نامانوس الفاظ اور جملوں کے استعمال سے پرہیز نہیں کیا ہے، مثلاً "ان تفاسیر کی قبولیت کا راز بذیل تفسیر آیات احادیث کا انبار لگا دینا ہے" (ص۳۴۱) اس مسئلہ کے انفصال میں ضیق پیدا کر دی (ص۲۱۸) خراج بالضمان والی احادیث غیر متولدہ زیادتی کی صورت میں مفید ہو سکتی ہے، (ص۲۴۴) شفاہی ملاقات، (ص۲۰۴) آبی (یعنی ابا کرنے والا) (ص۲۰) شبابی (ص۱۵) اخفائی، (ص۳۲) توصفات (ص۲۵۱) اطرار مادح (ص۲۴۴) زوایا (ص۲۰۳) معسکر (ص۲۰۶) اویم ارض (ص۳۰۱) خفی و خفی (ص۳۰۲) زلات (ص۳۰۲) تجہیل، ص۳۰۹، مشاغبہ، ص۳۳۹) متعدد الفاظ کی تذکیر و تانیث میں غلطیاں ہیں، جیسے دقار ص۴۰ تعارف ص۴۹ شغل ص۱۱۳ حکم ص۹۹ وضوء ص۱۱۷ تعاقب ص۱۳۶ حوصلوں، ص۱۴۷، اصرار ص۱۹۳، مشن ص۱۸۸، حصول ص۱۵۳ وغیرہ مذکر ہیں لیکن مصنف نے ان کو مونث لکھا ہے، اور دوپہر ص۴۳ تشکیل ص۴۲، جماعت ص۱۱۹، قوت ص۱۲۴ موہبت ص۱۲۵، زبانی ص۱۰۲، حد ص۱۱۰ تقریب ص۹۰ رسوائی ص۹۰، مادر علمی ص۹۰ قسم ص۱۹۳ صدارت

ص۱۶۶ اکثریت ص۱۰۰ برادری ص۲۶۲ تجارت ص۲۷۴ نظر ص۲۸۱ شخصیتوں ص۲۸۳ جلا ص۲۹۳ روشن ص۲۹۵ وغیرہ مونث ہیں لیکن ان کو مذکر لکھا ہے، موطا، مسند احمد اور ہدایہ کو بھی مذکر لکھ گئے ہیں، خصوصیات ص۱۵۵، علوم وفنون ص۱۵۰ اشعار ص۱۶۳، سوانح ص۲۵۴ عنوانات ص۲۷۱، مشکلات ص۲۹۰ علل واسباب ص۳۰۰، تفردات ونوادرات ص۲۴۵ وغیرہ جمع ہیں لیکن مصنف کی تحریر میں واحد استعمال ہوئے ہیں، اور طبقہ ص۱۰۲ اور بیان ص۲۴۵ واحد ہیں، مگر جمع استعمال کئے گئے ہیں، نوادرات، شرحات اور سندات وغیرہ بے تکلف لکھ گئے ہیں، قلع قمع، طول طویل، عرض معروض اور حیص بیص وغیرہ بلا واؤ استعمال ہوتے ہیں، مگر مصنف نے واؤ کے ساتھ استعمال کیا ہے، معطوف اور معطوف علیہ میں یکسانیت کا لحاظ نہیں کیا گیا، ہے، جیسے محبت وسعادتوں ص۶ روابط وتعلق ص۹ میں ایک مفرد اور دوسرا جمع ہے، اسی طرح آفتاب وقمر میں ایک فارسی اور دوسرا عربی ہے، بعض جملوں میں الفاظ کی تقدیم وتاخیر کا خیال نہیں رکھا گیا ہے، جیسے ایک سادات خاندان ص۳۹، دار العلوم کے بعض صدارت تدریس کے عہد (ص۱۶۶) بعض اس کی جزئیات (ص۲۲۲) مندرجہ ذیل جملوں میں خط کشیدہ الفاظ زائد اور بلا ضرورت ہیں، جیسے ملاقات کے بعد میں فرمایا ص۱۴۳ صوفیا سے ایک غیر معمولی عقیدت تھی (ص۱۶۳) ایک جگہ لکھا ہے اشعار موضوع فرماتے ص۲۶۹ اشعار موزوں کئے جاتے ہیں، شاہ صاحب نے اپنے بھولے پھولے انداز میں فرمایا ص۴۲ یہ علمی زبان نہیں ہے، صحیح جسم نات بان بلکہ مرزا پھویا ص۳۷ تان بان کے بجائے دھان پان استعمال ہوتا ہے، نذر قارئین کو ہر جگہ نظر قارئین اور نقہی مکاتب کو فقہی مکاتیب لکھا ہے، شعاعوں کا املا شعاؤں (ص۲۳۳) اور مولانا نذیر حسین محدث دہلوی کو نظیر حسین ص۳۵ لکھا ہے، اس طرح کی غلطیاں اور بھی ہیں، مصنف ایک مشاق اہل قلم ہیں، یہ بے احتیاطی کسی طرح انکے شایان شان نہیں،

(ض)

جلد ۱۲۲ ماہ محرم الحرام ۱۳۹۹ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۸ء عدد ۶

مضامین

مقالات

تلخیص وتبصرہ

وفیات